

قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام والامام محمد قاسم النانوتوی

بانی دارالعلوم دیوبند

اور اکابر امت کے علوم وافکار کا نقیب



NIDA-E-DARUL-ULOOM WAQF DEOBAND



مدیر اعلیٰ

حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب دامت برکاتہم

دفتر ماہنامہ

ندائے دارالعلوم وقف دیوبند

ضلع سہارنپور، یوپی (انڈیا)

قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام والامام محمد قاسم النانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند

اور اکابر امت کے علوم وافکار کا نقیب



جلد نمبر ۱۴ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۴ھ مطابق جنوری ۲۰۲۳ء شمارہ نمبر ۶

مدیر اعلیٰ

حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

مدیر :

مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی

نائب مہتمم : دارالعلوم وقف دیوبند

ڈائریکٹر : حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند

مدیر مسئول :

مولانا عبداللہ ابن القمر الحسینی

ناظم : شعبۂ نشر واشاعت

دارالعلوم وقف دیوبند

شرح خریداری

فی شمارہ	۲۵/روپے
سالانہ علاوہ ڈاک خرچ	۲۵۰/روپے
سالانہ مع ڈاک خرچ	۳۲۵/روپے
تاعمر	۵۰۰۰/روپے

◯ اس دائرہ میں سرخ نشان علامت ہے آپ کی مدتِ خریداری مکمل ہوچکی، رسالہ جاری رکھنے کے لئے دفتر سے رابطہ کریں۔

شائع کردہ : شعبۂ نشر واشاعت، دارالعلوم وقف دیوبند، سہارنپور (یوپی)

MONTHLY NIDA-E-DARUL ULOOM WAQF DEOBAND

SAHARANPUR (U.P.) INDIA PIN : 247554

Website: www.dud.edu.in / Email : nidaedarululoom@gmail.com

اس شمارے میں

ماہنامہ ’’ندائے دارالعلوم‘‘ دارالعلوم وقف کی ویب سائٹ پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ **Website: www.dud.edu.in**

نوٹ : خریدار حضرات رسالہ سے متعلق ضروری معلومات کے لئے اوقاتِ دفتر ۸ تا ۲ بجے ہی رابطہ کریں۔ +91 8439412767, +91 8439512767

اداریہ

حسن یوسفؑ دم عیسیٰؑ ید بیضا داری

حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب مدظلہٗ ❖

گذشتہ دنوں دورانِ سفر ایک سوال سامنے آیا کہ نبیٔ کریم ﷺ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے مثالی حُسن و جمال کے درمیان تطبیق کی وہ کونسی صورت ہوسکتی ہے جس سے کہ توازن کا ایسا پیمانہ قائم کیا جائے کہ بہر دو انبیائے کرام کے مقام عزت و عظمت کا حق بھی ادا ہو اور کوئی ایسا حرف بھی نہ آسکے جو ہمارے ایمان کے لیے کسی بھی درجے میں دوراز کار خطرہ ہی بن سکے! اس سوال کا اجمالی جواب تو یہ ہے حُسن یوسف تحیر واستعجاب اور محویت و خود فراموشی کے اوصاف کو محیط ہے جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمودہ جمال ظاہری پرکشش وگرویدگی اور جذب وانجذاب کی صفات حاوی ہیں، البتہ اس تطبیق کا قدرے تفصیلی خاکہ کچھ یوں بنتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے حسن باطن کے ساتھ حُسن ظاہری بطور معجزہ عطاء فرمایا تھا اور استنادی بحث سے الگ ایک مرتبہ برسبیل مطالعہ ایک روایت نظر سے گذری تھی راوی اور مقامِ روایت گذرے وقت کے ساتھ ذہن سے محو ہے البتہ مفہوم کچھ اس طرح سے تھا کہ کلام اللہ میں سورۂ یوسف کو احسن القصص قرار دیئے جانے میں منجملہ متعدد علمی و عملی، اور بلحاظ وقت اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کی تمثیل و مثال سے رہتی دنیا کو روشناس کراتے ہوئے انتظامی و معاشرتی، سیاسی وسماجی اور عبرت و نصیحت کے حِکم وعلل میں ایک حکمت یہ بھی پنہاں تھی کہ از آدم تا آخر دم بنی نوع انسانی کو دیئے جانے والے تقدیری حُسن ظاہر کے دس حصوں میں سے نو حصے صرف حضرت یوسف علیہ السلام کو عطاء فرمائے گئے اور باقی ایک حصہ ٔحُسن رہتی دنیا تک مخلوق بنی آدم پر تقسیم کردیا گیا اور اس طرح حُسن یوسفی کو تا روز قیامت بطور ضرب المثل دوام حاصل ہوگیا، یوں تو حقائق کی سطح پر ہر ایک جزو واقعہ اپنے آپ میں فکر رسا کی تجزیاتی راہوں کو مستقیم کرتے ہوئے نت نئے پہلوؤں کو روشنی فراہم کرتا ہے جس پر اہل علم نے اپنے اپنے زاویہ ٔفکر سے

❖ مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

مدیر اعلیٰ ماہنامہ ندائے دارالعلوم وقف دیوبند

نئے نئے نقاط سے طالبانِ علم کو روشناس کرایا ہے جو کہ ایک وقت طلب اور تفصیل طلب بات ہے البتہ زیرِ بحث موضوع پر اشاراتی استدلال کے نقطۂ نظر سے اسی ایک جزو واقعہ کو بنیاد بناتے ہوئے موضوع کو آگے بڑھاتے ہیں کہ زوجۂ عزیز مصر کی دعوت کے موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے سے نقاب اٹھتے ہی عورتوں کا وارفتگی کی حالت میں اپنی انگلیوں کا کاٹ لینا اور آخری درجے کی حالت تحیر میں بیک زبان بے ساختہ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ إِنْ هٰذَآ إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (سبحان اللہ، یہ کوئی انسان نہیں ہے یہ تو کوئی بڑی عزت والا فرشتہ ہے) پکار اٹھنا حُسنِ یوسف پر صفت حیرت واستعجاب، محویت وخود فراموشی، توحش وتحیر اور سرگشتگی وحواس باختگی کی دلیل ہے، موضوع کے حوالے سے ڈاکٹر علی محی الدین قرہ داغی کی تصنیف کا محترم جناب ذکی الرحمٰن صاحب غازی مدنی نے ''سیدنا یوسف علیہ السلام مسلم اقلیتوں کے لیے نمونہ'' کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے، کتاب مذکور مختلف ناحیوں سے بے حد معلوماتی اور قابل مطالعہ ہے، واقعۂ مذکورہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مترجم موصوف واقعاتی تسلسل کے ذیل میں **فلما سمعت بمكرهن** کے عنوان کے تحت صفحہ ۲۰۰ پر رقم طراز ہیں کہ: ''زوجۂ مصر نے طبقۂ اعیان کی عورتوں کی بدگوئیوں کو مکر و سازش سے تعبیر کیا تھا کیونکہ اس نے ایک موقعہ پر ان عورتوں کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کے تئیں اپنے جذب وشوق کا اظہار کیا تھا اور ان سے عہد لیا تھا کہ وہ اس راز کو کبھی افشاں نہیں کریں گی مگر ان عورتوں نے اپنے عہد کی پابندی نہیں کی اور جیسے ہی زوجۂ مصر کی ناکام کوشش کا چرچہ عام ہوا تو انہوں نے خوب نمک مرچ لگا کر بیان کرنا شروع کردیا، چنانچہ زوجۂ مصر نے مزید طعن وتشنیع اور خوف بدنامی سے بچنے کے لیے ان تمام عورتوں کو دعوت نامہ بھیجا تاکہ وہ بھی دامِ حسنِ یوسف کا شکار ہوجائیں جس کے لیے ایک آرام دہ مجلس آراستہ کی گئی اور اس میں خورد ونوش کا سامان رکھوادیا گیا اور پھر جب عورتوں نے چھریوں سے پھل کاٹنے شروع کیے تو عین اسی موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام کو رونما ہونے کا حکم دیا گیا اور جیسے ہی عورتوں کی نگاہ ان پر پڑی آنکھوں سے ایک روشنی گذرگئی، نگاہیں خیرہ ہوگئیں، اور خرمن دل پر حسن یوسف کی ایسی بجلی کوندی کہ ہوش وخرد کو بہالے گئی اور وہ حسن یوسف کی جلوہ افروزی کی محویت میں پھلوں کی جگہ اپنی انگلیاں ہی تراش کر بیٹھیں'' گویا کہ جنوں کے زیر اثر شعور وخرد کا تعطل تحیر واستعجاب کے مرتبۂ کمال کا غماز تھا، اس واقعاتی پس منظر میں مقصد موضوع یہ ہے کہ حسن جب بھی جہاں بھی اور جس چیز میں بھی جلوہ آشکار ہوگا تو حیرت واستعجاب اور محویت وتحیر آفرینی کے غلبے کے ساتھ ظاہر ہوگا، لیکن جہاں اعجازی حُسن منتہائے کمال کا مظہر ہو تو وہاں عقل کی خرد آفرینیاں بھی بحر حیرت میں غرق ہوکر معطل ہوجاتی ہیں جیسا کہ دریں موقع اس کیفیت کا پیش آنا ہے۔

آ یئے! اس حقیقت حُسن کا دوسرے زوایۂ فکر ونظر سے بھی جائزہ لیتے ہیں، عام طور پر اردو میں حُسن کے ساتھ جمال کا استعمال مترادف معنی میں ہوتا ہے جس کو زبان کی فصاحت اور بلاغت کا استعارہ سمجھا جاتا ہے اور لغت میں مترادف استعارات کا استعمال حسن بیان، حسن تحریر اور فصاحت و بلاغت کی دلیل متصور ہوتی ہے، لیکن دو لفظوں میں معنوی قربت کے باوجود بلحاظ مفہوم کسی نہ کسی حیثیت سے فرق کا پایا جانا یا ایک کا دوسرے سے ممیز ہونا بھی لفظ کے مستقل بالمعنی ہونے کے لیے شرط لازم ہے جس سے کہ اس کی فردیت قائم ہوتی ہے اور اس زاویہ سے ہر ایک لفظ کی اپنی جداگانہ حیثیت بہر حال مسلم ہے چنانچہ اس نقطۂ نظر سے اگر حُسن و جمال کی منفرد تحلیل کرتے ہیں تو جمال محمد ﷺ اور حُسن یوسف کا فرق واضح ہو جائے گا کہ بہر دو لفظ حُسن اور جمال اپنے معنی و مفہوم اور اثر کے لحاظ سے اپنی مکمل انفرادیت کے تناظر میں اپنی اپنی جگہ پر جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ اگر ایک طرف حُسن یوسف کا اعجاز استعجاب کی کاملیت کا اظہار ہے تو دوسری طرف رُخ جمال مصطفی ﷺ کا بدل زمین و فلک پر کوئی بھی حسین سے حسین تر شئے پیش کرنے سے عاجز ہے کیونکہ حُسن کی مذکورہ صفات کے بالمقابل جمال میں کشش و محبوبیت، جذب و انجذاب، گرویدگی و بیساختگی، فریفتگی و شیفتگی، محبت و رغبت اور رجوع والتفات کے مفہوم کا غلبہ پایا جاتا ہے:

حُسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں ☆ سر کٹاتے ہیں تیرے نام پہ مردانِ عرب

یہی وجہ ہے جس قلب میں جس قدر بھی صالحیت کا عنصر موجود تھا اگرچہ وہ ذرۂ ارض کے برابر ہی کیوں نہ ہو وہ جلد یا بدیر نبی کریم ﷺ کے جمال ظاہری کے رعب و کشش اور جمال معنوی کی انجذاب انگیز قوت نورانیت سے منور ہو کر اپنی ذات میں خود معنوی کشش و انجذاب کا استعارہ بن گیا چنانچہ شمائل رسول کے حوالے سے نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ میں جمال محمد کے اظہار کے لیے شمس و قمر کی نورانیت سمیت دنیا کی کوئی بھی حسین سے حسین شئے کی تشبیہ بھی تمثیل جمال محمدی کے سامنے بزبان حال درماندہ و مجبور نظر آتی ہے اور کسوٹی جمال پر پورا اترنے سے قاصر ہے، نبی کریم ﷺ کے حلیۂ مبارک کی جو تفصیلاتِ شمائل و خصائل کتب احادیث سے ہمیں ملتی ہیں اس کے مطابق نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کا جمال ظاہری بھی جمال معنوی کے مثل اتمام کمال کی آخری بلندیوں پر نظر آتا ہے، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رسالت کے رعب و جلال کے ساتھ ساتھ نبی پاک ﷺ کے حُسن و جمال سے اس درجہ متاثر تھے کہ سامنا ہوتے ہی گویا کہ از خود رفتگی کے اسیر ہو گئے ہوں منجملہ متعدد بیان کردہ تمثیلات میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نفس موضوع کی مقصدیت کو محیط ہے، فرماتے ہیں کہ مجھ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا آپ ﷺ کا روئے مبارک شمشیر آبدار کی طرح تابناک تھا؟ کہا نہیں بلکہ شمس و قمر کی طرح تھا، ایک روز

چاندنی رات تھی مطلع صاف تھا اور آسمان پر چودھویں کا چاند اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ منور وروشن تھا، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کہ مجھے اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت وقربت کا شرف عظیم حاصل تھا اور میں از خود رفتہ ہوکر کبھی روئے تاباں کو دیکھتا تو کبھی چودھویں کے چاند پر نظر کرتا، لیکن میں بقسم کہتا ہوں کہ رُخ انور مبارک کی آب وتاب اور نورانیت کے سامنے چودھویں کے چاند کا حُسن ماند اور مدھم تھا اور آپ مجھے چاند سے ہزاروں گنا حسین نظر آرہے تھے، صحابۂ کرام نے اپنے اپنے زاویۂ فکر ونظر کے مطابق مختلف تشبیہات سے جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان کیا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ کائنات کی کوئی بھی حسین سے حسین شئے جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تمثیل نہیں بن سکتی ہے، بلا شک وریب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وشکوہ، شوکت و عظمت، شرف وشان، سطوت وجلالت، توقیر وتمکنت، بزرگی وبرتری اور شان ووقار کا منبع اصل تو آپ کا مقام رسالت ہے لیکن ان تمام تر جمال اعجازی کے ساتھ ظاہری حُسن بشری میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اِکمال و تکمیل کے منتہی درجہ پر فائز نظر آتے ہیں چنانچہ حُسن ظاہر کا جو عکسِ جمیل ہمیں احادیث مبارکہ سے ملتا ہے اس کے مطابق آپ کا سراپا کچھ یوں ہے کہ قد نہ بہت طویل اور نہ کوتاہ بلکہ ایسی درمیانی شان لیے ہوئے ہے کہ بلند قامتوں میں بھی ممتاز اور پستہ اُٹھان والوں میں بھی نمایاں، اور جسم اطہر ایسا متوازن کہ جس کے آگے لفظ تناسب کے تمام نوک وپلک کی درستگی کے اِتمام کا کوئی درجہ باقی ہی نہ رہا ہو، رنگت سُرخ آمیز سفیدی سے مزین و مجلی، مائل بہ کشادہ جبین مبارک، ناک قدرے دراز، بشرۂ مبارکہ پر تناسب کا اتمام، دہن کشادہ، گردن مائل بہ فراز، سینہ فراخ، سر کے بال کسی قدر گھنگریالے، آنکھیں سُرمگیں حسن کے ساتھ سیاہ روشن اور مژگان مبارک دراز، شانے پُرگوشت، کلائیاں متوازن حُسن طوالت سے مزین اور کف دست کشادہ، ایڑیاں سبک وگداز اور کف پا درمیان سے قدرے خالی، بالفاظ مختصر یہ کہ ؎ وہ کمال حُسن حضور ہے کہ گمان نقص جہاں نہیں۔

مختصر یہ کہ حسن ظاہر کے اِتمام پر اصل حُسن معنوی حاوی ہے جو سیرت محمدیہؐ پر قائم ہے جس کی اساس انک لعلیٰ خلق عظیم ہے، حق تعالیٰ رحمتیں نازل فرمائیں جناب مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمہ اللہ پر جو کہ ایک ہی شعر میں حُسن ظاہری اور جمال معنوی کی بہترین عکاسی کرگئے:

حسن یوسفؑ دم عیسیٰؑ ید بیضا داری ☆ آنچہ خوباں ہمہ دارند تُو تنہا داری

معجزۂ حسنِ یوسف ہو کہ اعجازِ دمِ عیسیٰ یا موسوی یدِ بیضا وہ تمام معجزات وکمالات جو باقی سب انبیاء رکھتے تھے وہ سب کے سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں جمع کردیئے گئے ہیں۔

وما علینا الا البلاغ المبین

بحث و تحقیق

قسط نمبر:۶۴

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ

کے علوم وافکار کی تشریح وترجمانی ''تقریر دلپذیر'' کی روشنی میں

مولانا غلام نبی قاسمیؒ ❖

اہل علم جانتے ہیں کہ حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی دینی بصیرت اور فرق ضالہ باطلہ کی تردید میں مضبوط عقلی دلائل آپ کا ایک ایسا امتیاز ہے کہ جو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اور حجۃ اللہ فی الارض شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بعد حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ کے حصہ میں آیا، حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند نے بتوفیق ایزدی حضرت نانوتویؒ کی جملہ تصانیف کی تشریح وتسہیل کا عزم کیا ہے۔

افادۂ قارئین کے لیے آغاز حضرت قدس سرہٗ کی مشہور تصنیف ''**تقریر دلپذیر**'' سے کیا جارہا ہے، امید ہے کہ یہ سلسلہ اہل علم کو پسند آئے گا۔

محمد شکیب قاسمی
ڈائریکٹر حجۃ الاسلام اکیڈمی

غرض، یہ احتیاجِ صفات۔ جو ذات کی طرف اپنے وجود وتحقق میں ثابت ہوا۔ ایسا نہیں، جو باعث حدوث زمانی ہو۔ یعنی یوں کہہ سکیں کہ ان کے ابتداے وجود کے لئے کوئی زمانہ معین ہے، جس سے پہلے ان کا وجود نہ تھا۔ اگر یہ ہو، تو ان کے مخلوق ہونے میں کیا تامل ہے؟ بلکہ یوں کہیے اس صورت میں تو ہماری ہی صفات ایک وجہ سے ان سے افضل رہیں۔ آخر ہماری صفات ہماری ذات کی طرح ہماری مخلوق نہیں۔ اور خدا کی صفات خدا کی مخلوق ٹھہریں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہماری صفات کو اپنے موصوف سے ایک طرح کا تجانس ہے اور خدا کی صفات کو اپنے موصوف سے یہ تجانس حاصل نہیں۔ اگر ان کو تجانس ہے، تو مخلوقات سے تجانس حاصل ہے۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ ایک شخص کسی چھوٹے سے بادشاہ کا وزیر ہو۔ اور دوسرا شخص وزیر نہ ہو، پر اس کی تنخواہ سے بڑی تنخواہ پر کسی بادشاہِ عظیم الشان کے یہاں کسی چھوٹے سے عہدے پر مامور ہو۔ یہ اس کی ترقی تنخواہ جیسے دربارۂ عظمتِ شان کام نہیں آتی اگر مجلس وزراء ہو، تو اس کو جگہ نہیں ملتی اور مجمع سلاطین ہو، تو وزراء کے ساتھ اس کو اذن نہیں ہوتا، ایسے ہی اگر چہ صفاتِ خداوندی اپنے آپ میں کیسی ہی قوت نہ رکھتی ہوں، پر مرتبے کے حساب سے ہماری صفات سے کم رہیں گی۔

الغرض، صفاتِ خداوندی بہ حسابِ احتیاج ایسی نہیں، جیسی مخلوقات، ذات وصفات دونوں کی

❖ سابق استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

محتاج ہیں۔ حیات، علم، مشیت، کلام، جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے جی میں کسی کام کے کرنے نہ کرنے کی ٹھان لیجئے، یعنی اپنے جی سے قول وقرار کر لیجئے۔ اس کے بعد ارادہ، قدرت، تکوین، یعنی اس کا کام کر دینا، ہر مخلوق کو اپنے خالق کی طرف کم سے کم ان سات صفتوں کی احتیاج ہے۔ اور صفات کو بجز ذات اور کسی کی احتیاج نہیں۔ اور اگر باہم صفات میں احتیاج بھی ہے، تو یہ نہیں کہ تمام صفات کی طرف کوئی صفت محتاج ہو، ورنہ کم سے کم اپنی طرف احتیاج لازم آئے، جس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔

البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض صفات بعض صفات کی محتاج ہوں۔ مثلاً ارادہ بایں وجہ کہ بے علم وفہم کسی جانب ارادہ متوجہ نہیں ہوسکتا، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اصل صفتِ ارادہ اپنے وجود وتحقق میں بھی وجودِ علم کا محتاج ہے۔ ورنہ تعلقِ ارادہ بے تعلقِ علمی ممکن ہوگا۔ وجہ اس کی وہی ہے کہ ارکانِ ضروریۂ حوادث کل تین چیزیں ہیں: ایک اصل وفاعل، جس کو معطی کہیے۔ دوسرے محل وقابل، جس کو لینے والا کہیے۔ تیسرے وصفِ متعدی، جس کو عطا کہیے۔ سوا ان تین چیزوں کے اور کسی چیز کی درحقیقت ضرورت نہیں، بہ شرطِ نقصان، اتمام کی حاجت ہوتی ہے۔ چنانچہ اوراقِ گذشتہ میں یہ مضمون بہ مددِ خداوندی ثابت ہو چکا ہے۔ پھر اگر ارادے کو اپنے وجود میں مستقل کہیے اور محتاج الی العلم نہ سمجھئے، تو درصورتِ تعلقِ ارادہ کسی مراد کے ساتھ ارادے کی جانب سے مراد کی جانب عطا کا تسلیم کرنا لازم ہے۔ اور علم کا بیکار ہو جانا ضرور۔ بالجملہ، درصورتِ استقلالِ وجودِ ارادہ، تعلقِ ارادہ بے واسطۂ علم ممکن ہوگا۔ چنانچہ ظاہر ہے، مگر یہ بات ایسی ہے، جس کے محال ہونے میں کسی کو تامل نہ ہوگا۔

الغرض، صفات میں باہم ایک دوسرے کی طرف وجود میں احتیاج معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ احتیاج باعثِ حدوثِ زمانی نہیں۔ حدوثِ زمانی جب لازم آئے جب کہ ان کے وجود میں ارادے کو بھی دخل ہو۔ اس لئے کہ ارادۂ خداوندی اگرچہ ذاتِ خداوندی کے ساتھ ہمیشہ ازل سے مثل دیگر صفاتِ خداوندی قائم ہے، مگر تعلق کے حساب سے دیکھئے، تو ایک آن سے زیادہ اس کو کسی چیز کے ساتھ تعلق نہیں رہتا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ارادے کا کام بجز حرکات اور کچھ نہیں۔ اپنے ارادے کو دیکھ لیجئے، نمونۂ ارادۂ خداوندی ہے۔ کیوں کہ ہم میں جو کچھ ہے، سب وہیں کا فیض ہے۔ علم اگر ہے، تو وہاں کے علم کا پرتو ہے۔ قدرت اگر ہے، تو اسی کی قدرت کا فیض ہے۔ ارادہ اگر ہے، تو اسی ارادے کی عطا ہے۔ ان صفات میں سے ایک بھی ہماری خانہ زاد نہیں۔ ورنہ وجود بھی خانہ زاد ہو اور خدائی لازم آئے۔ چناں چہ ابھی اس کے اثبات سے فراغت پائی ہے۔ اور جب یہ صفات ہماری خانہ زاد نہیں، تو بے شک کہیں ایسی جگہ سے آئی ہوں گی، جہاں یہ خانہ زاد ہوں گی۔ وہ کون ہے؟ خدائے کون ومکان ہے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی چیز کے

ایک طرف سے دوسری طرف جانے میں اس کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔ اس کے اوصافِ اصلی میں فرق نہیں آجاتا۔ آگ کو اِس مکان سے اُس مکان میں لے جایئے، تو نہ اس کی حقیقت میں کچھ فرق پڑے گا، نہ اس کی حرارت میں کچھ تفاوت آئے گا۔ اس لئے یہ ضرور ہے کہ ہمارے ارادے میں جو بات ہو، وہ وہیں کی بات ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ارادے سے بجز حرکاتِ ظاہرہ وباطنہ اور کچھ صادر نہیں ہوتا۔ ہاں وہ حرکات اکثر اشیاء کے بن جانے، یا بگڑ جانے کے سامان ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح یوں سمجھئے کہ ارادۂ خداوندی سے بھی یہی حرکاتِ ارادیہ صادر ہوتی ہیں اور وہ حرکات، عالم میں انقلاب کا باعث ہوجاتی ہیں۔ یعنی کبھی موت ہے، کبھی حیات ہے، کبھی صحت ہے، کبھی بیماری ہے، کبھی کسی کی دولت ہے، کبھی کسی کی نوبت ہے، کبھی ہوائیں چلتی ہیں، کبھی تھم جاتی ہیں کبھی آفتاب طلوع ہوتا ہے، کبھی غروب ہوجاتا ہے، اور اس طلوع وغروب کے باعث کبھی دن ہوجاتا ہے، کبھی رات آجاتی ہے، کبھی گرمی ہے، کبھی سردی ہے۔ یہ سب انقلاب بے واسطہ، یا باواسطہ، خداوندِ عالم کے ارادے کے آثار ہیں اور کسی حرکت کی انتہا، یا ابتدا، یا عین حالتِ حرکت کا ظہور ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر انقلاب کے لئے ایک حرکت کی ضرورت ہے، جس کی ابتدا سے حالتِ سابقہ اور انتہا سے حالتِ موجودہ منقلب ہوجاتی ہے۔ ورنہ انقلابِ احوال اور تبدلِ حالات کی پھر کوئی صورت نہیں۔ ہاں یہ مسلّم کہ کبھی حرکت سے تبدلِ مکانات ہوتا ہے اور کبھی تبدلِ کیفیات اور کبھی تبدلِ کمیات۔ اگر ایک جا سے دوسری جا کو جایئے، یا لے جایئے، تو یہ ''حرکتِ مکانی'' ہے۔ اور اگر چکی کی طرح ایک ہی مکان میں چکر کھایئے، تو یہ حرکت کُل کے حق میں حرکتِ مکانی نہیں، ''حرکتِ وضعی'' ہے۔ کیوں کہ کُل کا مکان وہی ہے، جو تھا۔ البتہ اوپر نیچے اور نیچے اوپر اور دائیں بائیں اور بائیں دائیں ہوگیا ہے۔ جس کا حاصل وہی تبدلِ وضع ہے۔ ہاں اجزا کے حق میں البتہ یہ ''حرکتِ مکانی'' ہے۔ اور اگر گرمی کے بعد مثلاً سردی، یا سردی کے بعد گرمی آئے، تو یہ ''حرکتِ کیفی'' ہوئی۔ اور اگر کسی کا چھوٹا سا قد بڑا ہوجائے، تو یہ ''حرکتِ کمّی ہوئی''۔ کیوں کہ کم مقدار کو کہتے ہیں اور یہاں ظاہر ہے کہ جس کا قد دراز ہوگیا ہے، اس کی شکل وصورت ہنوز وہی ہے، جو تھی۔ ورنہ یوں نہ کہہ سکتے کہ یہ شخص وہی ہے۔ آخر اس قول سے کہ زید مثلاً بڑا ہوگیا، اونچا ہوگیا، یا موٹا ہوگیا، ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ باوجود اس تبدلِ قد وبدن کے کوئی ایسی بات ہے کہ اول سے لے کر اب تک بدستور باقی ہے۔ اور حرکت میں بھی ہوتا ہے کہ متحرک اول سے لے کر آخر حرکت تک بجنسہٖ باقی رہتا ہے۔ البتہ مکانات، یا اوضاع، یا کیفیات، یا کمیات میں تغیر آجاتا ہے۔

الغرض احوال بدلتے ہیں، صاحبِ احوال نہیں بدلتا۔ اگر صاحبِ احوال بھی بدل جائے، تو پھر کوئی دیوانہ بھی اس کو حرکت نہیں کہتا۔ اگر چہ تبدلِ صاحبِ احوال بھی حرکت ہی کے سبب ہوتا ہے۔

بالجملہ، تبدلِ قد وقامت وغیرہ ایک جدی حرکت ہے، حرکتِ مکانی کی قسم نہیں۔ ہاں یہ صحیح کہ حرکت مقدار کے لئے عالم اجسام میں سبب اگر ہے، تو یہی حرکتِ مکانی ہے۔ اس لئے کہ اجزائے غذا کے بڑھنے سے قد بڑھتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اجزائے غذا کو اگر حرکتِ مکانی نہ ہو، غذا منہ میں نہ جائے، یا جائے پر معدے سے آگے اطرافِ بدن میں نہ جائے، تو پھر زیادتیٔ قد وجسم کی کوئی صورت نہیں۔ اور یہ اجزا کا اِدھر سے اُدھر جانا ہی حرکتِ مکانی ہے۔ مگر یہ اُس شکل کا لمبا، یا چوڑا چکلا ہوجانا البتہ اور حرکت ہے، حرکتِ مکانی نہیں۔

غرض، بہ لحاظ تبدلِ مکانی اجزائے غذا، حرکتِ مکانی کا اقرار ضرور ہے۔ اور اگر صورت کو مکانی کہیے، تب بھی بہ لحاظ تبدلِ مکانِ صورت حرکتِ مکانی ہوگی۔ مگر بہ لحاظ تبدل قد وقامت۔ جو واقعی ایک جد الحاظ ہے۔ بہر حال سوائے حرکتِ مکانی ایک اور حرکت کا اقرار ضرور ہے۔ مگر ''ہر چہ بادا باد''۔ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال اور انقلاب بدون حرکت متصور نہیں۔(۱)

❁......❁......❁

---

(۱) صفات باری تعالیٰ نہ اس کی ذات کا عین ہیں نہ غیر، جیسے سورج کی جو روشنی زمین پر آتی ہے وہ دھوپ کہلاتی ہے۔ یہ دھوپ بے شک سورج کی ہے مگر یوں نہیں کہہ سکتے کہ دھوپ، سورج ہے گویا دھوپ اور سورج میں عینیت نہیں البتہ یوں کہہ سکتے کہ اس دھوپ کی اصل سورج ہے ایسے ہی صفاتِ خداوندی بھی ہیں کہ وہ مرتبۂ ذات میں تو نہیں ہیں البتہ ذاتِ خداوندی اس کی صفات کی اصل ہے۔ اس مثال میں جس طرح دھوپ آفتاب کا عین نہیں ہے اسی طرح آفتاب کا غیر بھی نہیں۔ اسی طرح صفاتِ خداوندی ذاتِ خداوندی کا عین نہیں ہیں مگر اس کا غیر بھی نہیں ہیں۔ اور یہ بات عقلاً بھی صحیح معلوم ہوتی ہے وہ اس طرح کہ اتصاف کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک موصوف کی اور دوسرے خود صفت کی، دوسرے لفظوں میں اتصاف کے لئے تعدّد لازم ہے اور تعدّد کو تغائیر لازم ہے۔ اگر ذات اور صفت میں تغائیر کے بجائے اتحاد ہو تو اتصاف درست نہیں ہوگا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مرتبۂ ذات میں صفات نہ ہوں ورنہ ذات اور صفات میں تغائیر کے بجائے اتحاد لازم آئے گا جو صحیح نہیں ہے۔ نیز تحقق ذات تو مستقل ہوتا ہے، مگر تحقق صفات مستقل نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ذات اور صفات میں عینیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حاصل یہ کہ صفاتِ خداوندی اگر چہ بہ نسبت مخلوق مستقل وجود رکھتی ہوں مگر بہ نسبت خداوندی شائبہ احتیاج بھی ہو البتہ ذاتِ خداوندی ہر صورت مستقل اور غیر محتاج ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب اور شعاع کہ شعاعیں بذات خود منوّر رہیں ایسا نہیں کہ زمین کی طرح اپنے منوّر ہونے میں اوروں کی محتاج ہوں مگر اس کے باوجود آفتاب کی طرح ان کا وجود مستقل نہیں بلکہ آفتاب کی محتاج ہیں۔ اسی طرح صفات خداوندی کو بھی سمجھئے۔ پھر احتیاج صفات جو ذات کی طرف اپنے وجود اور تحقق میں ثابت ہوئی، وہ ایسی نہیں جو حدوث زمانی کا باعث ہو، یعنی یوں کہہ سکیں کہ ان کے ابتدائے وجود کے لئے کوئی زمانہ معین ہے، جس سے پہلے ان کا وجود نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو ان کے مخلوق ہونے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا، مگر صفاتِ باری تعالیٰ کے ابتداء وجود کے لئے کوئی زمانہ معین نہیں ہے بلکہ ذاتِ باری تعالیٰ کی طرح صفاتِ باری تعالیٰ بھی ازلی اور قدیم ہیں۔ اسی طرح صفاتِ باری تعالیٰ میں مخلوق کی ذات وصفات کی طرح احتیاج نہیں ہے پر یہ امکان ہے کہ بعض صفات، بعض صفات کی محتاج ہوں مثلاً صفتِ ''ارادہ''، (جب ہم کسی کام کا ارادہ کریں تو) علم کی محتاج ہے۔ اور علم قدرت کا محتاج ہے، قدرت شوق اور رغبت کی محتاج ہے اور رغبت، نفع ونقصان پر اطلاع کی محتاج ہے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے کہ مخلوق کی صفات خدا تعالیٰ کی صفات کا پرتو ہیں۔

مقالات و مضامین

قسط (۳)

حدیث اور علوم حدیث: ایک تعارف

مولانا محمد اسلام قاسمی ❖

تدوین حدیث کی مختلف صورتیں

منکرین حدیث یہ کہا کرتے ہیں کہ احادیث تیسری صدی ہجری میں مدوّن کی گئیں، اس لئے یہ اعتماد نہیں ہے کہ وہ اصلی صورت پر باقی رہی ہوں، لیکن یہ مغالطہ بالکل بے بنیاد ہے، اس لئے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ حدیث کی حفاظت کا عہدِ رسالت سے لے کر اب تک کیا اہتمام ہوا، حفاظت حدیث کا راستہ صرف کتابت ہی نہیں، بلکہ دوسرے قابل اعتماد ذرائع بھی ہیں، اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت اور عہد صحابہؓ میں حفاظت حدیث کے لئے تین طریقے استعمال کئے گئے، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

حفظ روایت

حفاظت حدیث کا پہلا طریقہ احادیث کو یاد کرنا ہے اور یہ طریقہ اس دور کے لحاظ سے انتہائی قابل اعتماد تھا، اہل عرب کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حافظے عطا فرمائے تھے، وہ صرف اپنے ہی نہیں بلکہ اپنے گھوڑوں تک کے نسب نامے ازبر یاد کرلیا کرتے تھے، ایک ایک شخص کو ہزاروں اشعار حفظ ہوتے تھے اور بسا اوقات کسی بات کو صرف ایک بار سن کر یا دیکھ کر پوری طرح یاد کر لیتے تھے، تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن میں سے ایک دو یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت جعفر بن عمرو الضمری بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ عبید اللہ بن عدی بن الخیار کے ساتھ حضرت وحشیؓ سے ملنے گیا، عبید اللہؒ نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ تو حضرت وحشیؓ نے فرمایا کہ میں آپ کو پہچانتا تو نہیں البتہ مجھے اتنا یاد ہے کہ آج سے سالہا سال پہلے میں ایک دن عدی بن الخیار نامی ایک شخص کے یہاں گیا تھا، اس دن عدی کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا تھا، میں اس بچہ

❖ استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

کو چادر میں لپیٹ کر اس کی مُرضعہ کے پاس لے گیا تھا، بچہ کا سارا جسم ڈھکا ہوا تھا، صرف پاؤں میں نے دیکھے تھے، تمھارے پاؤں اس بچہ کے پاؤں کے ساتھ بہت مشابہ ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جو قوم اتنی معمولی باتوں کو اتنے وثوق کے ساتھ یاد رکھتی ہو وہ آں حضرت ﷺ کے اقوال وافعال کو یاد رکھنے کا کتنا اہتمام کرے گی، جبکہ وہ انھیں اپنے لئے راہِ نجات سمجھتے ہوں، خاص طور سے جب کہ آں حضرت ﷺ کا یہ ارشاد ان کے سامنے آچکا تھا کہ: **نضر الله عبدا سمع مقالتی فحفظها و وعاها واداها الخ رواه الشافعي و البيهقي في المدخل ورواه احمد والترمذی وابوداود و ابن ماجة والدارمی عن زید بن ثابت.** (۱)

حافظ ابن حجرؒ نے اپنی کتاب الاصابہ میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کے حافظہ کا امتحان لینا چاہا اور انھیں بلا کر احادیث بیان کرنے کی درخواست کی، حضرت ابوہریرہؓ نے بہت سی احادیث سنائیں، ایک کاتب ان کو لکھتا رہا، یہاں تک کہ حضرت ابوہریرہؓ چلے گئے، عبدالملک نے اگلے سال انھیں پھر بلوایا، اور ان سے کہا کہ جو احادیث آپ نے پچھلے سال لکھوائی تھیں، وہی احادیث اسی ترتیب کے ساتھ سنایئے، حضرت ابوہریرہؓ نے پھر احادیث سنانی شروع کیں، کاتب اپنی کتاب سے ان کا مقابلہ کرتا رہا، کسی جگہ ایک حرف ایک نقطہ ایک شوشہ کی تبدیلی نہیں کی، انتہاء یہ ہے کہ ترتیب بھی بالکل وہی تھی اور کوئی حدیث مقدم و موخر نہیں ہوئی۔ اس قسم کے حیرت انگیز واقعات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو غیر معمولی حافظے صرف حفاظت حدیث کے لیے عطا فرمائے تھے، بلاشبہ ایسے حافظے حدیث کے لیے اتنے ہی قابل اعتماد ذرائع ہیں جیسے کتابت۔

دوسرا طریقہ تعامل

حفاظت حدیث کا دوسرا طریقہ جو صحابہؓ نے اختیار کیا تھا، وہ تعامل تھا، یعنی وہ آپ ﷺ کے اقوال وافعال پر بجنسہا عمل کر کے اُسے یاد کرتے تھے، بہت سے صحابہ سے منقول ہے کہ انھوں نے کوئی عمل کیا اور اس کے بعد فرمایا **هكذا رایت رسول الله ﷺ وسلم یفعل**، یہ طریقہ نہایت قابل اعتماد طریقہ ہے، اس لئے کہ جس بات پر انسان خود عمل کرے وہ ذہن میں کالنقش علی الحجر ہوتی ہے۔

کتابتِ حدیث

احادیث کی حفاظت کتابت کے ذریعہ سے بھی کی گئی، اور تاریخی طور پر کتابت حدیث کو چار مراحل پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ المصابیح کتاب العلم، الفصل الثانی، ج: ص ۳۵

(۱) متفرق طور سے احادیث کو قلمبند کرنا۔

(۲) کسی ایک شخصی صحیفہ میں احادیث کو جمع کرنا، جس کی حیثیت ذاتی یادداشت کی ہو۔

(۳) احادیث کو کتابی صورت میں بغیر تبویب کے جمع کرنا۔

(۴) احادیث کو کتابی صورت میں تبویب کے ساتھ جمع کرنا۔

عہد رسالت اور عہد صحابہ میں کتابت کی پہلی دو قسمیں اچھی طرح رائج ہو چکی تھیں، منکرین حدیث عہد رسالت میں کتابت حدیث کو تسلیم نہیں کرتے اور مسلم وغیرہ کی اُس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا **لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحه** منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ آں حضرت ﷺ کا کتابت حدیث سے منع فرمایا، اس کی دلیل ہے کہ اُس دور میں حدیثیں نہیں لکھی گئیں، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احادیث حجت نہیں، ورنہ آپ انھیں اہتمام کے ساتھ قلمبند فرماتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتابت حدیث کی یہ ممانعت ابتداء اسلام میں تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت تک قرآن کریم کسی ایک نسخہ میں مدوّن نہ ہوا تھا، بلکہ متفرق طور سے صحابہ کے پاس لکھا ہوا تھا، دوسری طرف صحابہ کرام بھی ابھی تک اسلوبِ قرآن سے اتنے مانوس نہ تھے، کہ وہ قرآن اور غیر قرآن میں باوّلِ نظر تمیز کر سکیں، ان حالات میں اگر احادیث بھی لکھی جاتیں، تو خطرہ تھا کہ وہ قرآن کے ساتھ گڈمڈ ہو جائیں، اس خطرہ کے پیش نظر اور اس کے انسداد کے لئے آپ نے کتابت حدیث کی ممانعت فرمادی، لیکن جب صحابہ کرام اسلوب قرآن سے پوری طرح مانوس ہو گئے تو آپ نے کتابت حدیث کی اجازت بھی دے دی، جس کے متعدد واقعات کتب حدیث میں منقول ہیں۔

(۱) جامع ترمذی میں امام ترمذیؒ نے ابواب العلم میں اس پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے، باب ماجاء فی الرخصۃ فیہ اور اس میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ **قال کان رجل من الانصار یجلس إلی رسول الله ﷺ فیسمع من النبی ﷺ الحدیث فیعجبه ولا یحفظه فشکی ذلك إلی رسول الله ﷺ فقال یا رسول الله إنی لَاَسْمَعُ من الحدیث فیعجبنی ولا احفظه فقال رسول الله ﷺ استعن بیمینك و اوما بیده الخط** (۱)

(۲) امام ابوداؤدؒ اپنی سنن میں اور امام حاکمؒ مستدرک (۲)

میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ **کنت اکتب کل شیی اسمعه من رسول الله ﷺ ارید حفظه فنهتنی قریش وقالوا اتکتب کل شیی تسمعه و**

(۱) جامع ترمذی، ج: ۲، ص: ۱۰۶-۱۰۷ (۲) ج: ۱، ص: ۴۰-۱، کتاب العلم، الامر بکتابة الحدیث

رسول الله ﷺ بشر يتكلم في الغضب و الرضا فامسكت عن الكتابة فذكرت ذلك إلى رسول الله ﷺ فاوما بإصبعه إلى فيه فقال اكتب فو الذى نفسى بيده ما يخرج منه إلا حق. (۱)

(۳) مستدرک حاکم میں انہی حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا قيدوا العلم قلت و ما تقييده قال كتابته. (۲)

(۴) عن ابى هريرة ان النبى ﷺ خطب فذكر قصة فى الحديث فقال ابو شاه اكتبوا لى يا رسول الله فقال رسول الله اكتبوا لابى شاه وفى الحديث قصة، هذا الحديث حسن صحيح. (۳) اس قسم کی احادیث اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ کتابت حدیث کی ممانعت کسی امر عارض کی بناء پر تھی اور جب وہ عارض مرتفع ہوگیا تو اس کی اجازت بلکہ حکم دیا گیا۔

علامہ نوویؒ نے منع کتابت حدیث کی ایک اور توجیہ ذکر کی ہے، اور وہ یہ کہ مطلقاً کتابت کسی بھی زمانہ میں ممنوع نہیں ہوئی، بلکہ بعض حضرات صحابہ ایسا کرتے تھے کہ آیات قرآنی لکھنے کے ساتھ ساتھ آں حضرت ﷺ کی تشریح وتفسیر بھی اسی جگہ لکھ لیا کرتے تھے، یہ صورت بڑی خطرناک تھی، کیوں کہ اس سے آیاتِ قرآنی کے ملتبس ہوجانے کا قوی اندیشہ تھا، اس لیے صرف اس صورت ممانعت کی گئی تھی، قرآن سے الگ احادیث لکھنے کی کوئی ممانعت نہیں تھی، علامہ نوویؒ کی یہ توجیہ بہت قرین قیاس ہے، اور اس کی تائید سنن نسائی کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، جو امام نسائیؒ نے كتاب الصلوٰة باب المحافظة على صلوٰة العصر میں نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے ایک غلام کو قرآن کریم لکھنے کا حکم دیا، اور جب وہ اس آیت پر پہنچا کہ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" تو حضرت عائشہؓ نے لفظ وسطٰی کے بعد وصلوٰۃ العصر بڑھانے کا حکم دیا، ظاہر ہے کہ لفظ العصر قرآن کریم کا جز نہیں تھا، بلکہ بطور تشریح بڑھایا گیا تھا، اور اس زمانہ میں چوں کہ متن اور شرح میں امتیاز کی وہ علامات رائج نہیں تھیں، جو بعد رائج ہوئیں، اس لئے یہ لفظ متن ہی کے ساتھ لکھ دیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابہ بھی آپ کی بیان فرمودہ تشریحات اسی طرح لکھ لیتے ہوں گے، ظاہر ہے کہ اگر اس رواج کو عام ہونے دیا جاتا تو متن قرآن کی تعیین اور حفاظت ایک دردِ سر بن جاتی، درحقیقت ممانعت کتابت حدیث کے ذریعہ اس عظیم خطرہ کا سدباب کیا گیا تھا، لیکن قرآن کریم سے الگ احادیث لکھنے کا رواج ہر دور میں جاری رہا، چنانچہ عہد صحابہ میں حدیث کے کئی مجموعے جو ذاتی نوعیت کے تھے تیار ہوچکے تھے، اس کی چند مثالیں اگلی قسط میں بیان کی جائیں گی۔ (جاری)

---

(۱) لفظہ لابی داود، ج:۲، ص:۵۱۳-۵۱۴، کتاب العلم (۲) مستدرک ج:۱، ص:۱۰۶، کتاب العلم قیدوا العلم بالکتابۃ
(۳) ترمذی، ج:۱، ص:۱۰۷/ ابواب العلم، باب ماجاء فی الرخصۃ فیہ، ورواہ البخاری فی کتاب العلم تحت باب کتابۃ العلم ج:۱، ص:۲۱، ۲۳

غریب اسلام

محترم جناب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحبؒ سابق استاذ دارالعلوم وقف دیوبند ۱۳؍صفر المظفر ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۱؍ستمبر ۲۰۲۲ء کو رحلت فرما گئے، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا کے مضامین ہمیشہ ''ندائے دارالعلوم وقف دیوبند'' میں انتہائی قدر واہتمام کے ساتھ بہ تسلسل شائع ہوتے تھے، جس کے لئے وہ وافر مقدار میں اپنے مضامین قبل از وقت داخلِ دفتر فرماتے تھے، جنہیں حسب ترتیب وحسب موقع شائع کیا جاتا تھا۔ مولانا کے انہیں مضامین میں سے مزید چند مضامین دفتر میں موجود ہیں، جنہیں ترتیب وار شائع کیا جارہا ہے۔ ان شاءاللہ۔ (ادارہ)

مولانا نسیم اختر شاہ قیصرؒ ❖

رسول اللہ ﷺ کی جس زمانے میں بعثت ہوئی اس زمانے کے احوال سے سیرتِ نبی کریم ﷺ اور تاریخ پر واقف لوگ بخوبی آگاہ ہیں کہ وہ زمانہ کیسا تھا، آپ نے کلمۂ حق بلند کیا تو کوئی سننے والا نہ تھا، اس لیے کہ تین سو ساٹھ (۳۶۰) بتوں کی پوجا کرنے والوں کے درمیان یہ ایک اجنبی آواز تھی۔ صدیوں کے فاصلے نے اس ماحول کو اتنا پراگندہ اور کفر زدہ بنا دیا تھا کہ وہاں شرک اور کفر کے سوا کچھ باقی ہی نہ رہا تھا، خدا کا تصور نہ تھا اس کی وحدانیت کا کوئی خیال دور دور بھی نہیں پایا جاتا تھا، وہ معبودانِ باطل کی پوجا کرتے اور سب کے اپنے اپنے عمل اور قول کے مطابق خدا تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کے درمیان کھڑے ہوکر خدائی پیغام پہنچایا تو وہ اسے کیسے قبول کرلیتے۔ یہ اسلام کی غربت یعنی ''اجنبیت'' کا زمانہ تھا اسلام کی ابتداء ہی اجنبی حالت میں ہوئی تھی، اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث مبارک یہ بتاتی ہے کہ ایسا پھر ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا اور عنقریب پھر اجنبی ہوجائے گا، جیسے شروع میں تھا تو ایسے وقت میں اس پر قائم رہنے والے اجنبیوں (غرباء) کے لیے خوشخبری ہے۔ (۱)

اسلام کی آواز اجنبی تھی اس آواز کو انتہائی حیرت سے سنا جاتا اور جو کچھ رسول اللہ ﷺ بیان فرماتے وہ ان کے لیے حیرت بھری بات ہوتی جو کچھ بھی آپ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوتا وہ ان لوگوں

❖ سابق استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

(۱) مسلم شریف

کے لیے نا قابلِ قبول ہوتی۔اسلام نے کافی وقت اجنبی کی حیثیت سے گزارااس لیے کہ اس ماحول میں کسی اجنبی آواز کی گنجائش ہی کہاں تھی رب العالمین نے رسول اللہ ﷺ کو اس کام پر معمور فرمایا اور آپ کو خلعتِ نبوت سے سرفراز فرما کر یہ عظیم ذمہ داری آپ کے سپرد فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام سست روی کے ساتھ ہی سہی پورے عالم میں پھیلا، خطۂ عرب سے نکل کر دیگر ممالک میں اس نے اپنے قدم جمائے اور یوں روئے زمین پر اس نے اپنے ہونے کا مکمل احساس دلایا۔نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے جو امتیازی پہلو ہمارے سامنے ہیں، ان میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے انتہائی عزم وحوصلہ کے ساتھ اس مشن کو مکمل کیا۔نہ آپ کا حوصلہ ٹوٹا، نہ آپ نے ہمت ہاری، نہ آپ خوفزدہ ہوئے، اور نہ آپ نے قدم پیچھے ہٹائے۔استقلال واستقامت کے ساتھ اللہ کے حکم کی تعمیل کو ہی زندگی جانا۔اور یہی آپ کا پیغمبرانہ منصب تھا۔جس کی لمحۂ آخر تک آپ نے تبلیغ بھی فرمائی اور حفاظت بھی کی۔

اسلام اجنبی نہ رہا اس کے دامن میں کامیابیوں اور کامرانیوں کے ہزاروں اور بے شمار واقعات موجود ہیں اس کی تاریخ حوصلہ مندیوں اور فرمار وائیوں کی تاریخ بھی ہے اس نے دنیا کے جس ملک میں اپنے پیغام کا آغاز کیا وہاں تحفظ کا احساس پیدا کیا اس نے لوگوں کو مطمئن کیا کہ اس کی آغوش میں سر ٹیکنے والے امن سے رہیں گے، سکون سے رہیں گے، دنیا بھی ان کے سامنے سرنگوں ہوں گی، اور آخرت میں بھی صرف انہی کا حصہ ہوگا جو خدائی تعلیمات اور احکاماتِ اسلام کی پیروی کریں گے۔ چناں چہ آج دنیا میں پچپن سے زائد اسلامی ممالک ہیں اور لگ بھگ دنیا کے تمام ممالک میں مسلمان بود وباش اختیار کیے ہوئے ہیں وہ ان ممالک کی تہذیبی وثقافتی پہچان اور علامتوں میں ایک خوبصورت علامت بن کر رہ رہے ہیں۔اسلام نے عروج کے کتنے مرحلے طے کیے اور کامیابیوں کی کتنی صدیاں بتائیں اس کی گواہ تاریخ عالم ہے۔وہ دور گزر رہا ہے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مگر اب ایک اور منظر بھی ابھر رہا ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی اور وہ منظر ہے اسلام کے پھر اجنبی ہوجانے کا۔

جس طرح ہم بدعملی کی زندگی گزار رہے ہیں اور تیزی کے ساتھ اسلام سے دور ہورہے ہیں اِدھر قرنِ اوّل اور زمانۂ نبوت سے بھی فاصلہ بڑھتا جارہا ہے وہ دن دور نہیں کہ اسلام پھر سے اجنبی بن جائے گا۔دیکھیں تو اسی تاریک دور سے ہمارا گذر ہو رہا ہے اور انہی ظلمتوں میں ہم جی رہے ہیں۔اسلام ہماری زندگیوں میں برائے نام رہ گیا ہے، کلمہ ہم نے پڑھ لیا خدا کی وحدانیت کا اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا ہم نے دل وزبان سے اقرار کرلیا ایمان کے جتنے گوشے ہیں ان سب کو ہم نے مان لیا مگر جب عمل کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو یہاں زیادہ کچھ اچھے حالات اور آثار نظر نہیں آتے۔اسلام نے اللہ کی عبدیت بندگی اور

غلامی کا حکم فرمایا تھا لیکن ہم اس حکم کی تعمیل میں مصروف نہیں ہمیں سچ کی تاکید کی گئی تھی سچ سے ہمیں کوئی تعلق نہیں، امانت کا حفاظت کا حکم ہوا تھا بد دیانتی ہمارا پیشہ بن گئی ہے۔ وفائے عہد کی توجہ دلائی گئی تھی وفا نہ کرنے کی ہم نے قسم کھالی۔ عزت وآبرو اور جان ومال کو تحفظ دینے کی بات کہی گئی تھی لیکن عزتوں کی پامالی اور جان ومال کا اتلاف ہمارے ہی ہاتھوں ہو رہا ہے۔ غرض جو تعلیمات اسلام نے ہمیں عطا فرمائیں تھی دینی ودنیاوی ترقیات وکامرانیوں کی بنیاد جن باتوں کو قرار دیا تھا انہی سے ہم دور ہوتے جارہے ہیں۔ اور یہ دوری ہی اسلام کی غربت کا سبب بن رہی ہے اور بنے گی اور فرمانِ رسول ﷺ ہر صورت میں ہمارے سامنے ہوگا کہ اسلام غریب تھا اجنبی تھا، اسلام غریب ہوجائے گا اجنبی بن جائے گا۔

اسلام غریب کیوں ہوجائے گا اس کو ہم دوبارہ لکھتے ہیں تاکہ وہ چیزیں ہمارے سامنے بالکل واضح ہوجائیں جو اسلام کے اجنبی ہونے کا سبب بنیں گی یہ اسلام دنیا کے لیے پیغامِ امن، پیغامِ رحمت، پیغامِ رواداری، پیغامِ رحم وکرم کے ساتھ ظہور پذیر ہوا تھا، اس کا یہ امتیاز ہمارے عمل سے سامنے نہ آسکا اور اس دور کا مسلمان یہ پیغام پہنچانے میں ناکام رہا ایسے ہی اور بھی بے شمار عملی چیزیں تھیں، جن سے ہم نے فاصلہ قائم کیئے رکھا اور اس خلیج کو اپنے عمل سے کم نہ کرسکے، نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں یا آئندہ نسلیں دیکھیں گی کہ اسلام ہماری کوتاہیوں، بے عملیوں، غفلتوں کی بناء پر غربت (اجنبیت) کے دور سے گذرے گا۔

❁……❁……❁

روشن چراغ

جناب سلمان غازی ❖

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اپنے حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے تو مسجد نبوی کے صحن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دو مجلسیں دیکھیں۔ ایک مجلس میں لوگ دعائیں مانگ رہے تھے اور اس کی طرف متوجہ تھے دوسری مجلس میں لوگ تعلیم دے رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ دعائیں کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے ان کو دے چاہے نہ دے اور دوسری مجلس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ تعلیم دے رہے ہیں۔ پھر آپ ﷺ دوسری مجلس کی طرف پلٹے اور یہ فرماتے ہوئے بیٹھ گئے: **انما بُعِثتُ معلّما** (مجھے تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے) اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر معلم کو جناب رسول اللہ ﷺ سے ایک نسبت ہوگئی جس کے سبب وہ قابل احترام ہے۔ علم کے حصول کے لئے جہاں اور بہت سی ضروریات ہیں وہیں استاذ کا ادب اور احترام بھی لازمی قرار دیا گیا۔ ہم اس دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ جس قوم نے اساتذہ کا ادب کیا اس نے ترقی کی اور جہاں استاذ کو ایک ملازم سمجھ کر اسی طرح کا برتاؤ کیا گیا وہ زوال پذیر ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہ نے ایک معلم کے قلب کو اپنی خاص صفتِ علم سے نوازا ہے۔ گویا وہ نہ صرف یہ کہ اللہ جل شانہ کے خزانۂ علم کا محافظ ہے بلکہ ان خزانوں میں سے اسے طلب کرنے والوں پر خرچ کرنے کی اجازت بھی ہے اسی لئے علما کو انبیاء کا وارث کہا گیا ہے، تو اب اس سے بڑھ کر کون سا منصب ہوسکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں جب طالب علم تھا تو ذلیل تھا اب لوگ میرے پاس علم سیکھنے کے لئے آنے لگے تو میں عزت والا ہوگیا۔ خود حق تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے نسبت کے سبب ایک معلم کی توقیر فرمائی: **اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ** (۱)

(آپ اپنے رب کی طرف علم کی بات اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلائیے)

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحاً (۲)

(اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو (لوگوں کو) اللہ کی طرف بلائے اور خود بھی نیک عمل کرے)

❖ ڈائریکٹر اقرأ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، ممبئی

(۱) ۱۶:۱۲۵ (۲) ۴۱:۳۳

اردو کے مشہور ادیب ابن انشا نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے۔ وہ کسی سرکاری وفد میں جاپان گئے۔ ایک مرتبہ ان کی کسی یونیورسٹی میں ایک جاپانی پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ کیونکہ چھٹی ہوگئی تھی اس لئے باتیں کرتے ہوئے وہ پروفیسر صاحب کے ساتھ باہر آگئے۔ اور صحن میں کھڑے ہوکر باتیں کرنے لگے۔ اس وقت تیز دھوپ تھی جو وہاں کی سردی میں خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ ابن انشا نے ایک عجیب بات محسوس کی کہ ہر طالب علم خواہ لڑکا ہو یا لڑکی ان کے پاس سے گذرتے ہوئے چھلانگ لگا کر گذر رہا ہے۔ انہیں حیرت ہوئی اور انہوں نے پروفیسر سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ ہر طالب علم ہمارے پاس آکر چھلانگ لگاتا ہے۔ پروفیسر صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ یہاں زمین پر میری پرچھائیں پڑ رہی ہے اور کوئی بھی طالب علم میری پرچھائیں پر پیر نہیں رکھنا چاہتا اس لئے یہاں سے گذرتے ہوئے وہ چھلانگ لگا کر جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ جس معاشرے میں استاذ کا اس درجہ ادب کا اہتمام ہو وہ کیسے ترقی نہیں کرے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جاپان نے دوسری جنگ عظیم میں مکمل تباہی کے بعد غیر معمولی ترقی کی۔ اس کے برخلاف مغربی معاشرہ میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ ان اساتذہ کو ہماری ادا کی ہوئی فیس سے تنخواہ مل رہی ہے اس اعتبار سے وہ ہمارے ملازم ہیں۔ ہر طالب علم کو بھی یہی یقین دلایا جاتا ہے کہ استاذ دراصل اس کا ملازم ہے۔ یہی نہیں اس معاشرے میں خود استاذ بھی اپنے آپ کو طلبہ کا ملازم سمجھ کر ان سے اسی طرح برتاؤ کرتا ہے جیسا ایک ملازم اپنے مالک سے کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ معاشرہ اخلاقی اعتبار سے بہت تیزی کے ساتھ روبہ زوال ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی امت کے لئے استاذ کا درجہ رکھتی ہے۔ یوں تو کلام اللہ میں آپ کی شان میں بہت سی آیات نازل ہوئیں لیکن ایک عجیب آیت ہے جس کا مفہوم سمجھ لیں تو جناب رسول اللہ کی ذات گرامی کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ فرمایا گیا: وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (۱)

اور (اے نبی تم) اللہ کے حکم سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے اور روشنی پھیلانے والے چراغ ہو۔

غور فرمایئے تو یہاں چراغ اس لئے استعمال ہوا کہ کیونکہ وہ اندھیرے میں روشنی پھیلاتا ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ نے بھی شرک کفر اور جہالت کے اندھیرے میں اپنے علم کے نور سے روشنی پھیلائی اور درحقیقت ان کی ذات مبارک علم کے نور کی انتہا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ روشنی دینے والی تمام چیزوں میں سورج سب سے زیادہ منور ہے اور کسی بھی روشن چیز کا مقابلہ سورج سے نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سیاہ وسفید کو بالکل وضح کر دیتا ہے تو پھر حق تعالیٰ جل شانہ نے آپ ﷺ کی ذات برکات کو سورج سے تشبیہ کیوں نہیں دی جو نور کی انتہا ہے۔ سورج کے بعد روشنی دینے والے اجسام میں چاند کا نمبر آتا

---

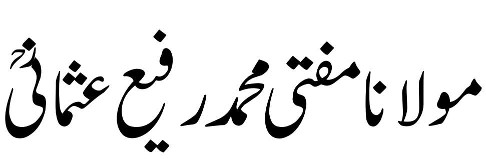
(۱) ۴۶/۳۳

ہے۔اُس کی بھی اچھی خاصی روشنی ہوتی ہے کہ اس کی روشنی میں انسان سانپ اور رسی میں فرق کرسکتا ہے۔ پھر ستارے اور دوسرے اجرام فلکی بھی منور ہیں۔اس اعتبار سے ہم جانتے ہیں کہ روشنی دینے والی تمام چیزوں میں روش چراغ ہی سب سے زیادہ حقیر اور کمتر ہے بلکہ دیگر اجسام کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔اس لئے ذہن میں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ پھر اللہ جل شانہ نے آپ ﷺ کی ذات با برکات کو نور پھیلانے والی انتہائی حقیر چیز سے تشبیہ کیوں دی۔

غور فرمایئے تو روشن چیزوں میں ہر ایک کے اپنے خواص ہیں۔جیسے سورج چاند ستاروں کی روشنی عمومی ہوتی ہے۔مثلاً جب سورج نکلا ہوا ہو اور آپ خواہ کمرے کے باہر دھوپ میں کھڑے ہوں یا بند کمرے میں، آپ اس کے نور سے استفادہ کر سکتے ہیں۔اس کے برخلاف اگر اندھیری رات میں کسی کمرے کے کونے میں ایک روشن چراغ رکھا ہو اور آپ کے ہاتھ میں ایک کتاب ہو تو چراغ سے دوری کے سبب آپ اس کتاب کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ پاتے۔کچھ قریب جانے سے الفاظ کچھ واضح ہو جائیں گے لیکن اس کتاب کو پڑھنے کے لئے آپ کو چراغ کے بالکل قریب جانا پڑے گا۔گویا روشن چراغ سے استفادہ کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ آپ اس سے قریب ہوں۔دراصل اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ بندوں کو یہی پیغام دے رہے ہیں کہ یہ میرے نبی ہیں جو میرے حکم سے تمہیں میرے پیغام کی طرف بلا رہے ہیں لیکن ان سے فائدہ تمہیں اسی صورت میں ممکن ہے جب تم ان کے قریب آؤ گے۔پھر چراغ ہی کی طرح جتنی تمہاری اِن سے قربت ہوگی اتنا ہی استفادہ بڑھے گا اس کے برخلاف تم جتنے دور جاؤ گے اتنے ہی تم محروم رہو گے۔کسی سے قربت کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ایک جسمانی اور دوسرا روحانی۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جسمانی اور روحانی طور پر رسول اللہ ﷺ سے قریب ترین تھے اس لئے امت میں کسی شخص کو بھی آپؐ کی ذات با برکات سے وہ فیض نہیں پہنچ سکتا جو اُن حضرات نے حاصل کیا۔ آپ ﷺ کے وصال کے بعد اب جسمانی قربت باقی نہیں رہی لیکن روحانی قربت آج بھی باقی ہے جو اہل ایمان کو حاصل ہے لیکن زمانے کی دوری کے سبب یہ قربت بھی کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی ہے جس کا اشارہ اس حدیث پاک میں ملتا ہے: **خیر القرن قرنی ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم.** بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر اس کے بعد اور پھر اس کے بعد کا زمانہ۔

زمانے کی دوری کے سبب گو روحانی قربت کم ہوتی جارہی ہے لیکن آج بھی ہم کلام اللہ اور آپ کے اسوہ پر عمل کر کے آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے قربت اور تمام فیوض حاصل کر سکتے ہیں۔یہ بھی آپ ﷺ کا معجزہ ہے کہ زمانے کی دوری کتنی بھی ہو آپ ﷺ کے یہ فیوض و برکات قیامت تک جاری رہیں گے۔

❁……❁……❁



مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ

علم وعمل کے پیکر اور دین ودانش کی نشانی

مولانا بدر الحسن قاسمی ❖

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلفاء اور حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے تلامذہ کو اللہ تعالیٰ نے خاص طرح کے شرف و امتیاز سے نوازا ہے، اسلامی علوم وفنون میں مہارت اور علمی تحقیقی کاموں کا ذوق ہو یا رشد و ہدایت کے مراکز اور اصلاحِ قلب اور تزکیۂ نفس کا میدان ہو، یہی لوگ سیاسی توڑ جوڑ اور منصب واقتدار کے لئے مکروفریب سے دور حضور اکرم ﷺ کی علمی وراثت اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعبیر وتقسیم کے مطابق آپ کی باطنی خلافت کی ذمہ داریوں کو پورے اخلاص کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہیں۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کے نامور شاگردوں میں علامہ یوسف بنوریؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ، حضرت مفتی اعظم محمد شفیع دیوبندیؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ یہ سب اپنے زمانہ کے ممتاز عالم ہی نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک مستقل ایک متحرک کتب خانہ اور دائرۂ علم کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری طرف حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بلند پایہ خلفاء پر نظر ڈالئے تو وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ پر رشد وہدایت کے مراکز اور اصلاح وتربیت کا نشان نظر آتے ہیں، وہ خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے وابستگان میں عقلاء ہی رکھے ہیں اور ان کی حکمت مآب شخصیت نے علمائے کبار اور عقلائے روزگار کو ان کے گرد اکٹھا بھی کر لیا تھا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ایک طرف فقہ وافتاء میں حضرت کے معتمد خاص اور ساری دنیا کے لئے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے، تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت علامہ کشمیریؒ کے علوم کا بھی وارث بنایا تھا اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سرچشمۂ رشد وہدایت اور تربیت وتزکیۂ نفس کا نمائندہ بھی۔

❖ کویت

وہ بلاشبہ اکابر علمائے دیوبند کی خصوصیات کے وارث وامین تھے، ان کے اپنے ہاتھوں سے لکھے ہوئے ایک لاکھ سے زائد فتوے اور ان کی تالیف کردہ سیکڑوں اردو اور عربی کی کتابیں اور رسائل ان کی عظمت کی گواہ ہیں۔ ان کی اردو تفسیر ''معارف القرآن'' ہو یا عربی تفسیر ''احکام القرآن'' کے اجزاء سبھی بے مثال ہیں۔ اللہ رب العزت نے ان کو اولاد بھی ایسی عطا کی جو ایک سے بڑھ کر ایک باکمال اور علم وعمل سے آراستہ نظر آتی ہے، خاص طور پر ان کے دو صاحب زادے: حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی کو اللہ رب العزت نے ایسا علمی مقام عطا فرمایا اور ایسا عملی امتیاز بخشا جس کی نظیر برصغیر ہی نہیں عالم اسلام میں بھی مشکل سے مل سکتی ہے۔ آج جب کہ حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اپنے جان آفریں خالق حقیقی کی آغوشِ رحمت میں پہنچ گئے ہیں تو یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۹ء کو دیوبند میں ہوئی تھی، باپ کا نام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے رکھا تھا اور بیٹے کا نام حضرت حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے۔ دارالعلوم میں زیر تعلیم ہی تھے کہ اپنے والد ماجد اور اہل خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ تقسیم ہند کے بعد کراچی پہنچ گئے۔ اساتذۂ کرام میں خود مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحبؒ، مولانا سبحان محمود صاحبؒ اور مولانا سلیم اللہ خان صاحبؒ جیسے باکمال رہے، علمی استادہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ اور علامہ محمد یوسف بنوریؒ سے بھی کیا اور دیگر اہل علم سے بھی اور اپنے والد بزرگوار کی ہدایت پر اصلاحی تعلق حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ سے قائم کیا اور اس طرح شیخ کی ہدایت کی پابندی کی کہ تقریروں سے روکا گیا تو دس سال تک تقریر سے باز رہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا کہ جس پر ساری دنیا آج رشک کرتی نظر آتی ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کی شخصیت بڑی خوبیوں کی حامل تھی، آپ ایک بلند پایہ اور بالغ نظر فقیہ اور مفتی تھے، ہزاروں فتوے آپ کی یادگار ہیں، آپ کو حدیث اور دیگر علوم سے بھی بھرپور مناسبت تھی، آپ نے ''عصرِ رسالت میں کتابت حدیث'' پر گراں قدر رسالہ تحریر فرمایا ہے۔

صحیح مسلم کے درس کا خلاصہ یا اس کی مختصر اردو شرح بڑے شگفتہ انداز پر تحریر فرمائی ہے؛ جس کی ۲رجلدیں انہوں نے مکہ مکرمہ کی ملاقات کے دوران عطا کی تھیں، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''فتح الملہم'' پر عربی زبان میں تعلیقات بھی تحریر فرمائی ہیں، فقہی کتابوں کے ضمن میں آپ نے علامہ ابن عابدین کی ''شرح عقود رسم المفتی'' پر بھی عربی زبان میں تعلیقات اور حواشی قلم بند کیے ہیں۔ ''المقالات الفقہیہ'' کے نام سے عربی زبان میں ان کے تحقیقی مقالات دو جلدوں میں شائع شدہ ہیں، ان کے چند عربی زبان کے مختصر رسائل کانفرنس کے لئے لکھے گئے تھے جن میں سے ''الأخذ بالرخص، بیع الوفاء، ضابط المفطرات، الصوم فی المذاهب الأربعة'' بین الاقوامی فقہ اکیڈمی طرف سے شائع کیے

گئے ہیں۔اردو کتابوں میں کتابت حدیث کے علاوہ ''تین معاشی نظام''، ''نوادر الفقہ''، ''احکام زکاۃ''، ''جناب مفتی اعظم اور میرے مرشد حضرت عارفیؒ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔صحیح امام مسلم اور بعض دوسری حدیث کی کتابیں وہ ہمیشہ پڑھاتے رہے ہیں اور روایتی تعلیم کے علاوہ ان کو اپنے والد ماجدؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، شیخ حسن المشاط مکی، مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے روایت حدیث کی خصوصی اجازت بھی حاصل تھی۔حضرت مفتی صاحب سے میری ملاقات تو دارالعلوم کراچی میں اس وقت ہوئی تھی جب کہ میں لیبیا کے سفر سے ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب کے ساتھ کراچی آیا تھا دارالعلوم العلوم کراچی میں ہی حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب سے ملاقات ہوئی پھر مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی معیت میں ان کی بعض مجلسوں میں حاضری کی بھی سعادت حاصل ہوئی اور عارفی صاحبؒ کی روحانی شخصیت کا گہرا نقش دل پر قائم ہوا۔مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب سے بیشتر ملاقاتیں مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنسوں کے موقع پر ہوتی رہی ہیں اور مفتی صاحب کی عظیم شخصیت کے جلوے دیکھنے کی سعادت بھی حاصل ہوتی رہیں، اپنی بیشتر تصنیفات بھی انہوں نے انہیں ملاقاتوں میں عنایت فرمائی تھیں۔ مزید کرم یہ فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب نے رکن یمانی اور حجر اسود کے سامنے اسی جگہ بیٹھ کر اپنی طرف سے روایت حدیث کی اجازت بھی مجھے عطا فرمائی، جہاں بیٹھ کر ان کو شیخ حسن المشاط مالکیؒ نے اجازت دی تھی۔

پھر حضرت مفتی صاحب نے اپنے دستخط کے ساتھ اپنی اسانید کا مجموعہ بھی ڈاک سے ارسال فرمایا جس پر ان کے دستخط ثبت ہیں اور وہ ''**الفضل الربانی فی أسانید محمد رفیع العثمانی**'' کے نام سے شائع شدہ ہے،حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب کی اسانید کا مجموعہ الگ سے چھپا ہوا ہے۔

آج حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ کے انتقال کے حادثہ پر اسی طرح کا احساس ہو رہا ہے، جس کا اظہار حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ان کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے انتقال پر دارالعلوم دیوبند کے ''نودرے'' میں اساتذہ اور طلبہ کے سامنے اپنے تعزیتی بیان میں کیا تھا۔مفتی صاحبؒ اور حضرت حکیم الاسلامؒ کی تعلیم کا زمانہ تقریباً ایک ہی تھا اور دونوں ہی اکابر علوم کے امین اور علم وفضل کی دنیا کے بے تاج بادشاہ رہے اور ایک عالم ان کی صداقت وامانت اور نفاست کا گرویدہ رہا ہے۔ ایک ''فتویٰ'' کی شان اور وقار تھے تو دوسرے کو خطابت اور حکمت بیانی کی بے مثال قدرت حاصل تھی اور دونوں میں سے کسی کی نظیر ان کے ہم عصروں میں سے پیش نہیں کی جاسکتی، یہ رخصت ہوگئے۔ان کے بعد اسی طرح آج حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ کا جانا بھی عجیب المناک حادثہ محسوس ہوتا ہے۔

مصائب اور تھے، پر ان کا جانا ☆ عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ کی زندگی کے کئی جلوے میں نے مکہ مکرمہ میں دیکھے، اکثر ہوٹلوں کے بجائے سرکاری دارالضیافہ میں قیام کو ترجیح دیتے تھے، جہاں سے حرم میں آمد ورفت کی سہولت زیادہ ہوا کرتی تھی۔ بعض مسائل میں ذہنی اشکال کا بھی کبھی اظہار فرماتے تھے، مثال کے طور پر ''صفا پیلس'' میں شرکائے کانفرنس کے لئے نماز کی مخصوص جگہ اور حرم کی نماز کی صفوں سے اتصال کا مسئلہ۔

دوسرا مسئلہ ریاض میں مقیم مفتی مملکت کی چار یا پانچ دن کے لئے مکہ مکرمہ آمد میں نماز کی امامت، حنابلہ وشافعیہ وغیرہ کے مسلک پر قصر کے بجائے اتمام کا مسئلہ۔ مسائل کا ذکر تو کر دیتے تھے؛ لیکن ان میں الجھتے نہ تھے اور ہم سبھوں کے ساتھ وہ بھی جماعت میں اسی طرح شرکت فرمایا کرتے تھے جس پر وہاں کا عمل تھا۔ مفتی صاحبؒ سے ڈاکٹر سعد الشہرانی اور دوسرے بہت سے اصحابِ علم وذوق نے روایت حدیث کی اجازت لی۔ حضرت مفتی صاحبؒ میں ہمدردی کا وصف بے پناہ تھا، دسروں کے ساتھ دکھ، درد میں شرکت کو اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھتے تھے۔ میرے لخت جگر محمد بدر القاسمی کا اردن میں جوانی میں انتقال ہوگیا تو میں غم والم کی تصویر بن گیا تھا، حضرت مفتی صاحبؒ اور ڈاکٹر محمود غازی مرحوم دونوں نے میرے قلم سے لکھی ہوئی غم کی داستان پڑھ کر گہرے تأثر کا اظہار فرمایا۔ غازی صاحب تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے؛ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ خود بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ کئی سال بعد جب میرے شریک حیات ام احمد نے بھی زندگی سے منھ موڑ لیا اور کرونا کی نذر ہوگئیں تو حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دونوں نے ٹیلی فون کر کے تعزیت فرمائی، تسکین دلایا اور صبر کی تلقین فرمائی۔ حضرت مفتی صاحبؒ ویسے بھی کبھی کبھی ٹیلی فون فرمایا کرتے تھے اور گفتگو کا موضوع رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ اپنے علم وفضل کے ساتھ ساتھ غیر معمولی اخلاقی عظمت اور قائدانہ اوصاف وخصوصیات کے حامل انسان تھے، بہت جلد گھل مل جانے والے، تواضع کے پیکر اور دنیا کے احوال پر گہری نظر اور زیر بحث مسائل پر واضح اور دوٹوک رائے رکھتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں ''فتویٰ'' سے متعلق عالمی کانفرنس رابطہ عالمی اسلامی نے منعقد کی تو حضرت مفتی محمد رفیع عثمانیؒ اور مولانا تقی عثمانی دونوں ہی موجود تھے اور افتتاحی اجلاس میں شرکائے کانفرنس کی طرف سے نمائندگی مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے ہی کی، اس اجلاس میں مکہ کے گورنر شاہزادہ خالد الفیصل بھی موجود تھے۔ کانفرنس کے بعد مدینہ جاتے ہوئے ریاض میں تمام مہمانوں کو ملک عبداللہ بن عبدالعزیز سے ''قصر الیمامہ'' میں ملاقات کرائی گئی؛ لیکن مفتی صاحب مکہ مکرمہ میں ہی رہ گئے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ کی وفات کا

سانحہ میرے نزدیک اس لحاظ سے بھی نہایت المناک ہے وہ اکابر دیوبند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ذہن ومزاج سے قریب اور شرعی نصوص کی ان کی بیان کردہ تشریح سے اپنے نامور برادرِ خورد کے ساتھ پورے طور پر آگاہ تھے، ان کا مزاج اپنے والد بزرگوار کی تربیت، حضرت تھانوی کے افادات پر عبور اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی کتابوں سے شغف اور حضرت عارفیؒ کی کیمیا نظر اثر نظر اور عملی تربیت نے ایسا بنا دیا تھا کہ اس میں فکری ناہمواری کے درآنے کی کہیں سے گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی؛ چنانچہ دونوں ہی ایک اکائی کی طرح اکابر کے علم، کتاب وسنت کی روح اور علمائے دیوبند کے ذوق ومزاج اور صحیح مسلک کے محافظ اور امین بن گئے تھے، اب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کی ذات تنہا رہ گئی ہے۔ چند سال پہلے جب مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب ہندوستان آئے اور دارالعلوم دیوبند میں ان کے لئے استقبالیہ جلسہ کا اہتمام کیا گیا تو دارالعلوم کے مدرس مولانا ریاست علی بجنوری صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے جو بات کہی تھی، اس کا ایک جملہ یہ بھی تھا کہ پہلے زمانے میں دارالعلوم کا مسلک جاننے کے لئے لوگ یہاں آتے تھے اور اکابر دارالعلوم سے رجوع کرتے تھے؛ لیکن آج صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا صحیح مسلک جاننے کے لئے ہمیں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب سے رجوع ہونے کی ضرورت ہے، جملہ اسی مفہوم کا تھا جو مجلّہ ''البلاغ'' بھی شائع ہوا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ قریبی عہد کے بعض اساتذہ نے دارالعلوم کے مسلک کو مشتبہ کرکے رکھ دیا ہے اور اپنی مزاجی بے اعتدالی اور ذہنی تہوار اور کم علمی کی وجہ سے ایسے ایسے دعوے صحیح بخاری اور سنن ترمذی کے اسباق میں کرڈالے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ابھی چند سال پہلے بعض خلیجی ملکوں میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے اور پٹرو ڈالر کو اپنی جماعت تک محدود رکھنے کے لئے برصغیر میں چھوٹا سا ایک ایسا گروہ سرگرم ہوگیا جس کی خاصیت ہی بدگمانی اور بدزبانی ہے۔ فقہائے کرام کو نشانہ بنانے کے بعد اکابر علمائے دیوبند سے عرب نوجوانوں کو ان کی ناواقفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بدظن کرنے کی مہم شروع کردی اور اسلم پاکستانی کے رسالہ میں جس فتنہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی اب کبھی ''القول البليغ في جماعة التبليغ'' اور کبھی ''الديوبندية'' کے نام سے اس کو ہوا دینے کی کوشش زور وقوت سے شروع ہوگئی۔ حضرت شیخ الہندؒ پر قرآنی آیت میں تحریف کا الزام، علامہ انور شاہ کشمیری کو نئے مدرس قرار دے کران پر تعصب کا الزام اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کی 'عبقات' جو خالص کشفی علوم، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے موضوع پر ہے اس کو مجددانہ کارنامہ کتاب پڑھے اور سمجھے بغیر ہی قرار دے ڈالا۔ اس زمانے میں غلط فہمیوں کے ازالہ اور غلط بیانیوں کے تدارک کے لئے میں نے ایک چھوٹا سا عربی رسالہ 'وجہ جدید' کے نام سے لکھا تھا، تو بڑا

سوال یہی سامنے تھا کہ ''دیوبندیت'' کیا ہے؟ اور مسلک دیوبند کی حدودِ اربعہ کی تعیین کس طرح کی جائے؟ اور اس میں مرجعیت کس کو حاصل ہے؟ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کا رسالہ بے حد قیمتی ہے؛ لیکن وہ مناظرانہ انداز کا ہے اور احمد رضا خان صاحب کی کفر ساز فیکٹری پر قدغن لگانے کے لئے لکھا گیا ہے۔ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی کتاب مسلک کے معتدل ہونے کے بیان میں بے مثال ہے؛ لیکن فکری اور اعتقادی الرجی میں مبتلا گروہ کی شفایابی اس کے ذریعہ شاید ممکن نہ ہو، بالآخر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اکابر دیوبند کے فتاویٰ کے جو مجموعے شائع شدہ ہیں، ان میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے لے کر حضرت الاستاذ مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے فتاوے ہی سند کی حیثیت رکھتے ہیں، ورنہ خوابوں کے مجموعے اور کرامات کی بھلیوں میں ارشد القادری کے ''زلزلہ'' کا سارا مواد موجود ہے۔

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مرحوم اور مولانا محمد تقی عثمانی کی شخصیت ایک اکائی کی طرح تھی، ان دونوں نے اپنے والد گرامی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی علمی و ذہنی تربیت اور حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحبؒ کی روحانی تاثیر کے ساتھ حضرت تھانویؒ کے علوم و معارف کو جس طرح ہضم کیا ہے کہ ان کا مزاج ایک خاص سانچہ میں ڈھلا ہو، معلوم ہوتا ہے؛ جس میں فکری بے اعتدالی کی گنجائش ہے اور نہ مسلکی رجحان میں کتاب وسنت کی تعلیمات اور حضور اکرم ﷺ کی سیرت کے جلووں سے دوری کا امکان، جس نے ان کو صحیح مسلک کا چلتا پھرتا ترجمان بنا دیا تھا، نہ تو اس وقت صحیح مسلک کی باریکیوں کا ادراک کرنے والا اور نہ بالغ نظری سے ان کی تشریح کرنے والا کوئی اور ہے۔ صحابہ کرامؓ اور ائمہ دین، فقہائے مسلمین کا یا جمہور اہل سنت کا جو مسلک ہے، علمائے دیوبند اسی پر قائم اور اسی کے محافظ ہیں اور اسلام، ایمان اور احسان کے تقاضوں پر مضبوطی سے قائم ہیں اور ہر طرح کی بدعت اور فکری انحراف کے شدت سے مخالف ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ اور مولانا محمد تقی عثمانی دونوں بھائیوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شخصیت کی تعمیر کی طرف حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی خاص توجہ رہی۔ دینی علوم کا سرمایہ تو خود اپنے گھر میں موجود تھا، پھر بھی اچھے اساتذہ سے تعلق، تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی خاص نظر، پھر خود اپنی تربیت میں رکھنے کے بجائے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی سے اصلاحی تعلق قائم کرانا بھی حضرت مفتی صاحب کی حکیمانہ تدبیر تھی کہ باپ کی شفقت شاید اس درجہ نگرانی میں رکاوٹ ہو، اس لئے دوسرے ولیِ کامل کی مدد لی جائے اور انہوں نے بھی ان کو مانجھنے اور سنوارنے کا روحانی فریضہ پوری توجہ سے انجام دیا۔ ذرا سے خدشہ کی بنیاد پر شہرت و مقبولیت کے باوجود تقریر کرنے پر مکمل پابندی لگادی جو دس سال تک جاری رہی اور دونوں بھائیوں نے اسے نہ صرف گوارہ کیا؛ بلکہ مکمل پابندی کی مثال قائم کردی۔

ایسی شخصیت جس کی فقہی بصیرت اور علمی قابلیت کا لوہا عالم اسلام کے علمی مراکز اور فقہی اکیڈمیاں مان رہی ہوں وہ اپنے شیخ کی ہر ہدایت کو بے چوں چرا تسلیم کرنے میں کوئی حرج محسوس نہ کرے، اسے خود ہی ولایت کا اعلیٰ مقام قرار دیا جاسکتا ہے۔

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ کے شاگرد اور فیض یافتگان دنیا کے ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، انہوں نے بھی دنیا کے بہت سے ممالک دیکھے ہیں۔ انہوں نے دارالعلوم کے انتظام وانصرام کا کام بھی بڑے اعلیٰ پیمانہ پر انجام دیا ہے، دارالعلوم کی عمارت جس سلیقہ سے تعمیر کی گئی، درس گاہوں اور خاص طور پر درالحدیث کا جونظام رکھا گیا ہے، دارالعلوم کراچی کے یہ ذمہ داران بنفس نفیس موجودہ زمانہ کے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کرنے میں عرب علماء سے آگے ہیں۔ ''تکملہ فتح الملہم''، ''فقہ البیوع''، ''المدونۃ الجامعۃ'' یہ سارے علمی کارنامے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے ہیں۔ مالی معاملات کے لئے معیار کی تدوین کا ادارہ دسیوں سال سے مولانا کی صدارت میں کام کررہا ہے۔ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کے وجود سے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کو بھی بڑی حد تک یکسوئی تھی۔

موجودہ زمانہ میں کس طرح کے عالم دین کی ضرورت ہے، اس سوال کا اب تک ایک ہی جواب ہے کہ موجودہ زمانہ کے عالم دین میں مولانا محمد رفیع عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی کی علمی اور عملی خصوصیات ہونی چاہئیں، اب تک اس کی کوئی دوسری مثال خال خال ہی پیش کی جاسکتی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ اور مولانا محمد تقی عثمانی اپنے علمی کمالات اور بعض مزاجی خصوصیات میں فرق کے باوجود ساری زندگی دو قالب ایک جان کی طرح رہے، باہم عظمت اور شفقت نے ایسا توازن پیدا کردیا تھا کہ وفات کے حادثہ پر مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی زبان سے اپنے ایک بازو کے علیحدہ ہوجانے کا اظہار اس طرح ہوا کہ ''طالب علمی کے زمانہ سے ہم ساتھ رہے، آج پچھتر سال کا ساتھ یک دم چھوٹ گیا۔'' اللہ تعالیٰ مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب کو فردوس میں جگہ دے اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے دست بازو کو مضبوط کرے اور انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے، ان سبھوں کا علمی فیض ہمیشہ قائم ودائم رکھے۔

مولانا کو بلاشبہ یہ کہنے کا حق ہے کہ:

و کنا کندمانی جذیمة حقبة ☆ من الدهر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کأنی و مالکا ☆ لطول اجتماع لم نبت لیلة معا

و فی الله عزاء وهو المستعان



فقہ اسلامی کی بنیاد اور ماخذ

مفتی امانت علی قاسمی ❖

فقہ اسلامی اسلامی شریعت کے وہ احکام و مسائل ہیں جو قرآن وحدیث سے ماخوذ و مستفاد ہیں، فقہ کی تعریف ہی کی جاتی ہے وہ عملی مسائل جو تفصیلی دلائل سے معلوم ہوئے ہوں، فقہ اسلامی قرآن وحدیث کی روشنی میں انسانی زندگی کے عملی مسائل کی نشان دہی کرتی ہے، یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ فقہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، اور نہ ہی اسلامی شریعت سے الگ کسی چیز کا نام ہے بلکہ فقہ اسلامی وہ پھول ہیں جو قرآن و حدیث کے باغ میں کھلتے ہیں، وہ پھل ہیں جو قرآن وحدیث کے درخت سے نکلتے ہیں، یہ وہ مجموعہ قوانین اسلامی کا نام ہے جس کا متن قرآن وحدیث ہے، جس کی تشریح فقہا نے کی ہے، حضرات فقہاء مجتہدین نے اپنے آپ کو اس بات کا پابند بنا رکھا تھا کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں لوگوں کے عملی مسائل کو دفع وار مرتب کریں تاکہ انسانی زندگی میں عمل کرنے میں سہولت ہو اور ہر وہ شخص جو خود قرآن وحدیث کی مراد تک نہیں پہونچ سکتا ہے اور اس کی تشریح نہیں کر سکتا ہے وہ فقہاء کے مرتب کردہ ان مسائل پر عمل کر سکے۔

حدیث قرآن کی شرح ہے، حدیث کے ذریعہ قرآن کے مجملات کا علم ہوتا ہے، اگر نبی کریم ﷺ مجملات قرآنی کا بیان نہ فرماتے تھے تو قرآن پر کما حقہ عمل کرنا ناممکن تھا، مثلاً: **اقیمو الصلاۃ** مجمل ہے، حدیث کے ذریعہ نماز کی ہیئت، رکعات کی تعداد، رکوع، سجدہ کی کیفیت کا علم ہوتا ہے اس لئے جس طرح شرح کے بغیر متن کا سمجھنا مشکل ہے اسی طرح حدیث کے بغیر قرآن کا سمجھنا اس سے زیادہ مشکل ہے، اور جس طرح حدیث قرآن کی شرح ہے اسی طرح فقہ حدیث کی شرح ہے اگر حضرات فقہاء حدیث کی شرح نہ کرتے تو حدیث کے اشارۃ النص، دلالۃ النص، عبارۃ النص، اقتضاء النص وغیرہ کا سمجھنا ناممکن تھا، گویا کہ فقہ کی سند حدیث سے ملتی ہے اگر درمیان سے حدیث کو ہٹا دیا جائے تو فقہ کا تعلق قرآن سے اس طرح ختم ہوجائیگا جیسے درخت سے تنا کو جدا کرنے کے بعد پھل، پھول اور پتوں کا تعلق جڑ سے ختم ہوجاتا ہے، جس طرح شاخ، پتیاں، تنا اور جڑ ایک دوسرے سے مربوط ہیں اسی طرح حدیث، قرآن اور فقہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔

❖ استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

امت میں ایک فرقہ منکرین حدیث کا پیدا ہوا جن کا نعرہ تھا حسبنا کتاب اللہ ہمارے لئے صرف قرآن کافی ہے، ہمیں حدیث کی ضرورت نہیں، انکار حدیث کی بنیاد ڈالنے والے تو اصل میں معتزلہ ہیں گرچہ معتزلہ جنس حدیث کا انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ جو حدیثیں بظاہر ان کی سمجھ سے بالاتر تھیں یا تو ان حدیثوں میں تاویل کر کے اپنے عقل کے مطابق کر دیا اور اگر تاویل میں کامیاب نہیں ہو سکے تو سرے سے ایسی حدیثوں کا انہوں نے انکار کر دیا بعد میں آنے والے لوگوں نے سرے سے جنس حدیث کا انکار کر دیا۔

حاصل یہ کہ فقہ قرآن وحدیث سے مستنبط قانون اسلامی کا نام ہے ڈاکٹر محمود احمد غازی نے لکھا ہے کہ: ''فقہ اسلامی پر گفتگو کرنے سے پہلے ایک غلط فہمی اپنے ذہن سے ہمیشہ کے لیے نکال دیجئے۔ یہ غلط فہمی بعض اوقات کم فہمی سے، بعض اوقات کسی منفی تاثر کے نتیجے میں، بعض اوقات کم علم لوگوں سے گفتگو کے نتیجے میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ فقہ اسلامی قرآن مجید اور حدیث رسول سے الگ کوئی چیز ہے۔ قرآن مجید اور فقہ اسلامی، قرآن مجید اور حدیث وسنت یہ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں اور ایک ہی چیز کو سمجھنے کے مختلف انداز ہیں۔(۱)

ڈاکٹر محمود غازی کے اس بات کو غور سے پڑھیے انہوں نے صاف اعتراف کیا ہے کہ فقہ اسلامی، قرآن وحدیث کی دوسری تعبیر کا نام ہے۔ امام ابوحنیفہ جن کو فقہ اسلامی میں سبقت حاصل ہے اور سب سے پہلے فقہ اسلامی کی تدوین کا سہرا آپ ہی کے سر جاتا ہے، آپ کے بہت سے مجتہدین نے آپ کے بنائے ہوئے پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے فقہ کی تدوین وترتیب میں کارہائے نمایاں انجام دیا ہے، امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کو جس ترتیب پر مدون کیا ہے اس کی انہوں نے خود وضاحت کی ہے موفق احمد مکی نے اس نہج کو ذکر کیا ہے چنانچہ امام صاحب کا قول ذکر کرتے ہیں:

إنی آخذ بکتاب اللہ إذا وجدته فما لم أجد فيه أخذت بسنة رسول الله والآثار الصحاح عند التي فشت في أيدي الثقات عن الثقات فإذا لم أجد في كتاب الله ولا سنة رسول الله أخذت بقول أصحابه من شئت وادع من شئت ثم لا أخرج عن قولهم إلیٰ غيرهم وإذا انتهى الأمر إلیٰ ابراهيم والشعبي والحسن والعطا وابن سيرين وسعيد بن المسيب وعد رجالا فقوم اجتهدوا فلي ان اجتهد كما اجتهدوا۔(۲)

میں (شرعی احکام میں) اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل کرتا ہوں جب وہ احکام مجھے کتاب اللہ میں مل جائیں اور جو احکام مجھے قرآن میں نہیں ملتے تو پھر سنت رسول اللہ اور ان صحیح آثار پر عمل کرتا ہوں جو ثقہ

(۱) محاضرات فقہ، ص:۱۲ (۲) مناقب أبي حنيفة للإمام الموفق: ۱/۸۰

راویوں سے منقول ہوکر ثقہ راویوں میں پھیل چکے ہیں اور اگر کوئی مسئلہ کتاب الٰہی اور حدیث نبوی میں نہیں پاتا ہوں تو صحابہ کے اقوال میں سے جن کا قول کتاب وسنت کے قریب پاتا ہوں اس پر عمل کرتا ہوں (البتہ حضرات صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں جاتا کہ) سارے صحابہ کے قول کو چھوڑ کر دوسرے قول کو اختیار کروں اور جب نوبت ابراہیم نخعی، عامر شعبی، محمد بن سیرین، حسن بصری، عطا، سعیب بن مسیّب (متعدد حضرات تابعین کے نام شمار کیے) تک پہونچتی ہے تو ان حضرات نے اجتہاد کیا ہے، لہذا مجھے بھی حق ہے کہ ان حضرات کی طرح اجتہاد کروں، یعنی ان حضرات کے اقوال پر عمل کرنے کی پابندی نہیں کرتا بلکہ ان ائمہ مجتہدین کی طرح خدائے ذوالمنن کی بخشی ہوئی اجتہادی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہوں اور اپنے فکر واجتہاد سے پیش آمدہ مسائل حل کرنے کی سعی پیہم کرتا ہوں۔

امام صاحب نے فقہ کی ترتیب میں قرآن وحدیث کو اصل معیار قرار دیا ہے اور قیاس کو ناگزیر حالت میں استعمال کیا ہے جب کہ کوئی نص نہ ملے اس کے باوجود یہ بھی کہا کہ اذا صح الحدیث فھو مذہبی جن مسائل میں حدیث نہ ملنے کی وجہ سے میں نے اجتہاد کیا ہے اگر اس میں کوئی صحیح روایت مل جائے تو وہی میرا مذہب ہوگا چنانچہ ابتداء سے ہی امام صاحب پر یہ الزام عائد ہوتا آرہا ہے آپ نے حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح دی ہے حالاں کہ جس درجہ حدیث کو مقام امام ابوحنیفہ نے دیا ہے کسی نے بھی نہیں دیا ہے چنانچہ حدیث موقوف اور حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر ترجیح دیا ہے اسی لیے اپنے اوپر لگے ہوئے الزام کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **عجبا للناس یقولون انی افتی بالرای ما افتی إلا بالأثر معناہ إذا وجدت أثرا افتی به.** (۱)

تعجب ہے ان لوگوں پر جو یہ کہتے ہیں کہ میں رائے سے فتوی دیتا ہوں جب میں کوئی اثر پاتا ہوں تو اثر سے ہی فتوی دیتا ہوں، امام موفق بن احمد مکی نے مناقب کے اندر کسی منصف کا قول نقل کیا ہے:

زعم بعض الطاعنين أن أبا حنيفة قال بالقياس وترك الأثر وهذا بهت منه وافتراء عليه فإن كتبه وكتب أصحابه مملوة من المسائل التي تركوا العمل فيها بالقياس وأخذوا بالأثر الوارد وفيه كانتقاض الطهارة بالضحك في الصلاة وبقاء الصوم مع الأكل ناسيا. (۲)

بعض طعنہ پرور کا گمان ہے کہ امام ابوحنیفہ اثر کو چھوڑ کر قیاس پر عمل کرتے ہیں حالانکہ یہ ان پر بہتان اور افتراء ہے؛ اس لیے ان کی اور ان کے شاگردوں کی کتابیں ان مسائل سے بھری پڑی ہیں جس میں انہوں نے قیاس کو چھوڑ کر اثر پر عمل کیا ہے جیسے نماز میں، قہقہہ لگانے سے وضو کا ٹوٹنا، روزے میں بھول کر کھا

(۱) مناقب لأبي حنيفة للإمام الموفق: ۱۶۲/۲ (۲) ۸۳/۱

لینے سے روزہ کا باقی رہنا وغیرہ، ان تمام شہادتوں سے یہ بات بالکل نمایاں ہوجاتی ہے کہ امام صاحب نے انتہائی مجبوری میں قیاس کی طرف توجہ کی ہے؛ چنانچہ الفقہ الحنفی وادلتہ میں لکھا ہے: **كان لا يقيس إلا عند الضرورة الشديدة.** (۱) امام صاحب شدید ضرورت پر ہی قیاس کو استعمال کرتے تھے۔

بہر حال فقہ اسلامی کی صورت حال شاید کسی حد تک سامنے آگئی ہوگی۔ یہ وہ باتیں ہیں جسے قدیم زمانے سے لکھا جارہا ہے لیکن آج کل جدید ذرائع ووسائل نے حالات کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے، آج تعقل پسندی کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے حالاں کہ مولانا گیلانی نے فتوحات مکیہ کے حوالے سے لکھا ہے: **ليس في قوة العقل من حيث ذاته ادراك شئي** (۲) کہ عقل کے اندر اپنی ذات کے اعتبار سے کسی چیز کو پانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ لیکن تعقل پسندوں کا ایک طبقہ ہے جسے اپنی عقلی طاقت پر ناز ہے ان کے سامنے ان کے عقل کے خلاف کوئی بھی چیز آجائے تو وہ اپنے عقل کی طاقت کو پست نہیں کرتے بلکہ طاقت کے زد میں جو کوئی بھی آجائے اس کو پست اور زیر کرنے میں لگ جاتے ہیں حد ہے کہ اگر قرآن کا کوئی حکم ان کی عقل کی رسائی سے باہر ہو تو وہ قرآن کی آیت کو ماننے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔

ایسے لوگ جو قرآن وحدیث کا علم رکھتے ہیں اور شریعت کے مزاج کو سمجھنے کا دعوی کرتے ہیں وہ حضرات جب فقہ اسلامی کے بعض مسائل کو اپنی عقل پر کھرا اترتا ہوا نہیں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ مسائل غلبہ کی نفسیات کا نتیجہ ہیں یعنی کہ انصاف کے ترازو میں کھرے نہیں ہیں بلکہ زور طاقت اور زور بازو کی نفسیات پر مبنی ہیں حد ہے ایک صاحب فقہ اسلامی کے بعض مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں ہماری فقہ میں جو زمین وغیرہ کی تقسیم کا مسئلہ ہے، دارالحرب اور دارالاسلام کی تقسیم ہے، اور دونوں جگہ کے لوگوں کے ساتھ الگ الگ معاملات ہیں، یہ سب قرآن کے وسیع امن وانصاف کے خلاف ہے، اس فقہ کی تدوین کے وقت قرآن نگاہ سے غائب ہوگیا تھا اس لیے ہمیں ان مسائل میں قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے'' حیرت ہے اگر یہ جملہ کسی اہل قرآن کی طرف سے کہا جاتا تو شاید تعجب نہ ہوتا لیکن حدیث کے پڑھنے پڑھانے والے لوگوں کی طرف سے اس طرح کی باتیں بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں، کیا فقہ کا ماخذ صرف قرآن ہے یا قرآن اور حدیث دونوں ہے، حدیث میں ہے آپ نے فرمایا ایک وقت ایسا آئے گا کہ کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے جو قرآن میں پاؤ اس پر عمل کرو جو قرآن میں پاؤ اسے رد کردو سنو میں تمہیں اس حال میں نہ پاؤں جس طرح قرآن نے کچھ چیزوں کو حلال اور حرام کیا ہے اسی طرح میں نے بھی کچھ چیزوں کو حرام وحلال کیا ہے اور میرا حرام کیا ہوا بھی اسی طرح ہے جس طرح قرآن کا حرام کیا ہوا ہے۔ حدیث میں صراحت ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں بیک وقت قابل عمل اور حجت ہیں۔

(۱) ۲۴/۱ (۲) تدوین فقہ ص:۱۶۲

موجودہ دور میں مستشرقین نے جو ہماری فقہ پر اعتراضات کئے ہیں آج کے تعقل پسندوں کو وہ اعتراضات حقیقت معلوم ہوتے ہیں اور وہ بجائے کوئی مناسب جواب تلاش کرنے کے فقہ اسلامی کی ہی کمی تلاشنے لگ جاتے ہیں، سوچتا ہوں کہ وہ لوگ کتنے ایمان دار ہیں کہ اپنے مشن کو کامیاب کرنے کے لیے سب کچھ کر جاتے ہیں اور ہم ہیں کہ قرآن وحدیث کا علم رکھ کر سوائے اپنی کمی کے اعتراف کے ہماری جھولی میں کچھ نہیں ہے، سوچنا چاہئے کہ ہر ایک کی بینائی ایک طرح نہیں ہوتی ہے ایک شخص کو ایک کیلومیٹر تک دکھائی دیتا ہے اور ایک شخص کو ایک میٹر تک بھی نہیں دکھائی دیتا ہے، یہ ہماری بینائی کا قصور ہے، اسی طرح ایک شخص کی عقل ایک چیز کو سمجھ لیتی ہے اور ایک عقل نہیں سمجھ پاتی ہے یہ عقل کا قصور ہے، ہمیں بعض مرتبہ اپنی کم عقلی کا بھی اعتراف ہونا چاہئے، ذرا سوچئے کہنے کو کہاں تک کہہ دیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ جس وقت فقہ کو مرتب کر رہے تھے ان کی نگاہ سے قرآن غائب تھا، اور ہمارے سامنے قرآن ہے اس لیے ہمیں ابوحنیفہ کی بات کے بجائے قرآن کی بات ماننی چاہیے، واہ صاحب!

بعض لوگوں کو سنا کہ جزیہ کا حکم فقہ اسلامی میں غلبہ کی نفسیات کا نتیجہ ہیں، ایک صاحب کو کہتے ہوئے سنا شریعت معصوم ہے اجتہاد معصوم نہیں یہ خوشنما تعبیریں کیا کہنا چاہتی ہیں، فقہ اسلامی فقہاء کی اجتہاد کا نتیجہ ہیں یعنی قرآن کے خلاف ہیں اس لیے انہیں ریجیکٹ کر دینا چاہیے ایک صاحب نے کہا کہ حدیث میں ہے کہ یہود کو کہیں راستے میں پاؤ تو ان کو تنگ راستہ کی طرف چلنے کے لیے مجبور کر دو، بتائے کہ اسلام کی یہ بات انسانی مساوات کے کس درجہ خلاف ہے، حیرت ہوتی ہے علماء عقل پر، اگر ایک چیز آپ کی عقل میں نہ آئے تو چیز غلط ہے چاہے وہ قرآن میں ہو یا حدیث میں ہو۔ کہنے کو تو الفاظ فقہ اسلامی کا ہے ورنہ یہ حملہ قرآن وحدیث پر ہے اس لیے کہ فقہ اسلامی کی زیادہ تر چیزیں قرآن وحدیث ہی ہے، اگر فقہ کا کوئی جزئی مسئلہ ہو اور قرآن وحدیث سے اس پر کوئی شہادت نہ ہو اور ضرورت ومصلحت اس میں تبدیلی کا متقاضی ہو تو اس پر انفرادی طور پر گفتگو ہوسکتی ہے لیکن عمومی اور مجموعی طور پر فقہ اسلامی پر اس طرح حملہ آور ہونا کہ فقہ اسلامی کی تدوین کا کام صحیح نہج پر نہیں ہوا ہے اور یہ فقہ قرآن وحدیث سے الگ فقہاء کے اجتہادات کا نتیجہ ہیں اس لیے جو عقل میں آئے اسے قبول کر لیا جائے اور جو عقل میں نہ آئے اسے رد کر دیا جائے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری مغلوب ذہنیت اور مرعوب فکر کی پیداوار ہے، فقہ اسلامی تو قرآن وحدیث کی اساس پر منتج ہیں غلبہ کی نفسیات پر نہیں لیکن ہماری مرعوب فکر کی بناء پر ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے۔



اسلام میں نکاح کی اہمیت اور ہمارا معاشرہ

مولانا اسجد عقابی ❖

اسلام میں نکاح کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**اذا تزوج العبد فقد استکمل نصف دینه، فلیتق الله فی النصف الباقی**'' جب کوئی بندہ شادی کرلے تو اس نے اپنا آدھا ایمان مکمل کرلیا ہے، اسے چاہئے کہ باقی آدھے میں اللہ سے ڈرتے رہے۔ مذہب اسلام میں نکاح کی اہمیت یہ ہے کہ اسے نبی کریم ﷺ نے نصف ایمان قرار دیا ہے۔ نکاح صرف مذہب اسلام میں ہی نہیں ہے بلکہ اسلام سے قبل جتنے بھی مذاہب آئے ہیں تمام امت میں اس کا رواج رہا ہے اور نکاح تمام انبیاء کرام کی سنت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''**ولقد ارسلنا رسلا من قبلك وجعلنا لهم ازواجا و ذریه**'' ہم نے آپ سے قبل رسولوں کو بھیجا ہے اور ہم نے انہیں بیویاں اور اولاد سے نوازا تھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **اربع من سنن المرسلین: الحیاء، والتعطر، والسواك والنكاح**'' چار چیزیں انبیاء کرام کی سنتیں ہیں، حیاء، خوشبو لگانا، مسواک کرنا اور نکاح کرنا۔

نکاح کب ضروری ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **و انکحو الایامی منکم والصلحین من عبادکم و امائکم، اِن یکونوا فقراء یغنهم الله من فضله، والله واسع علیم**'' اور اپنے میں سے غیر شادی شدہ (خواہ شادی نہ کی ہو یا کسی اور سبب سے بیوی یا شوہر نہ ہو) نیز اپنے غلاموں اور باندیوں میں سے جو نکاح کے لائق ہوں، ان کا نکاح کردو، اگر وہ تنگ دست ہیں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو مالدار کردیں گے اور اللہ وسعت والے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔ اس آیت میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ جب بندہ یا بندی شادی کی عمر کو پہنچ جائے اور کوئی عذر بھی نہ ہو تو ان کا نکاح کردینا چاہئے۔ نکاح میں بلاوجہ تاخیر مذہب

❖ استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

اسلام میں ممنوع ہے۔قدرت کے باوجود نکاح سے دور رہنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ایک مرتبہ چند صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے باہمی صلاح ومشورہ سے رہبانیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ان حضرات نے پہلے امہات المؤمنینؓ سے آپ ﷺ کی عبادت وریاضت کے متعلق دریافت فرمایا اور ایک عزم اور حوصلہ کے ساتھ کہ اب دنیاوی معاملات سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لینا ہے، وہاں سے روانہ ہو گئے۔ نبی کریم ﷺ جب تشریف لائے تو آپ ﷺ کو ان کے عمل اور ان کی نیت سے آگاہ کیا گیا۔آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا:''اَنتم الذین قلتم کذا و کذا، اَما وَالله لاَخشاکم لله و اَتقاکم له، لکننی اصوم و اُفطر و اُصلی و ارقد و اَتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی.'' کیا تم لوگوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟ خبردار! اللہ کی قسم، میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں، اس کے باوجود میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نوافل بھی ادا کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، پس جس شخص نے میری سنت سے روگردانی کی وہ مجھ سے نہیں ہے (میرے طریق پر نہیں ہے)۔اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے نکاح کی استطاعت کے باوجود نکاح سے دور رہنے پر منع فرمایا ہے۔

نکاح کن کے لئے ممنوع ہے

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''یا معشر الشباب، من استطاع الباءۃ فلیتزوج، فاِنه اغض للبصر و احصن للفرج، ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فاِنه له وجاء'' اے نوجوانو! جس کے پاس نکاح کی استطاعت ہے اسے چاہئے کہ نکاح کرلے، کیونکہ نکاح نظریں جھکانے اور شرمگاہ کو تحفظ دینے کا قوی ذریعہ ہے، اور جو استطاعت نہ رکھے تو وہ روزوں کی پابندی کرے، کیونکہ روزے کی شدت شہوت کو توڑ دیتی ہے۔اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے واضح اور صریح الفاظ میں نکاح کرنے اور نہ کرنے کی ترغیب دی ہے۔اگر بندہ قابل استطاعت ہے اور بیوی کے حقوق ادا کرنے پر قادر ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ نکاح کرلے تاکہ غیر فطری کام میں مشغول نہ ہو۔دوسری جانب رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے جو بیوی کے حقوق ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے ہیں۔حقوق کی ادائیگی کے بغیر خوشگوار زندگی کا تصور محال ہے۔نکاح کا مقصد صرف خواہشات کی تکمیل نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ ایک کامیاب اور خوشحال معاشرہ کی تشکیل مقصود ہے۔گھریلو زندگی جس قدر خوشگوار ہوگی، گھر کا ماحول بھی اسی قدر پُرسکون ہوگا، جب گھر کا ماحول پُرسکون ہوگا تو یقیناً معاشرہ اور سماج کا ماحول خوشگوار ہوگا۔ایک بہترین، مثالی اور خوشگوار معاشرہ کی تشکیل کے لئے نکاح ضروری ہے۔اسی طرح ایسے افراد کو بھی نکاح کرنے سے منع کیا گیا ہے جنہیں کامل یقین ہے کہ وہ نکاح کے بعد انصاف قائم نہیں کرسکیں گے یا حقوق کے ادا کرنے سے عاجز وقاصر رہیں گے۔

برکت والا نکاح

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا''اِن اَعظم النکاح برکة ایسرہ مؤنہ'' سب سے برکت والا نکاح وہ ہے جس میں کم خرچ ہو۔اس حدیث میں دونوں جانب یعنی میاں بیوی ہر دو کیلئے نصیحت ہے۔مہر اور دیگر نان ونفقہ کے نام پر بیوی کی جانب سے ایسے مطالبات نہ پیش کئے جائیں جوشوہر پر بار گزرے یا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو۔ایسے اضافی مطالبات کی صورت میں یا تو شوہر کے دل میں بیوی کی جانب سے محبت کے بجائے کدورت بیٹھ جائے گی یا پھر وہ بیوی کی خوشنودی اور اس کی محبت کے لئے ایسے اقدامات کرنے پر مجبور ہوگا جو شرعا ناجائز اور سماجی طور پر بُرے سمجھے جاتے ہیں۔دوسری صورت یہ ہے کہ شوہر کی جانب سے جہیز یا ضروریات زندگی کے نام پر ایسے مطالبات رکھے جائیں جو بیوی اور اس کے اہل خانہ کے لئے باعث تکلیف ہو۔بسا اوقات رشتہ طے ہونے کے بعد، مجبوری میں ایسے ناجائز مطالبات کو ماننا پڑتا ہے جو ان کے لئے ضروری بھی نہیں تھے اور نہ ہی وہ لوگ اس کے اہل ہیں۔جہیز معاشرتی زندگی کا محبوب ناسور بن چکا ہے جس سے چھٹکارہ حاصل کرنا ضروری ہے۔

ہمارے معاشرہ میں شادی بیاہ کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے، اسے کسی ایک فریق کی جانب منسوب نہیں کیا جاسکتا ہے۔معاشرہ کی بُرائی کا ذمہ دار کون ہے؟ اسے کسی فرد یا مخصوص طبقہ کی جانب منسوب نہیں کیا جاسکتا ہے۔یہ ایک معاشرتی ناسور ہے جس میں ہر کوئی ملوث ہے اور ہر کوئی اس بیماری سے جوجھ رہا ہے۔نام ونمود اور ظاہری ٹھاٹ باٹ کو برقرار رکھنے کے لئے بہترین نمائش اور حد درجہ اہتمام بھی اسی قبیل سے ہیں۔صاحب استطاعت افراد اپنی شان دکھانے اور برقرار رکھنے کے لئے شرعی حدود کو پھلانگ جاتے ہیں جبکہ غریب اپنی عزت بچانے کے لئے قرض کے بوجھ تلے دب کر معاشرہ کی لعن طعن سے بچنے کے لئے ایسے اقدامات کرتا ہے۔حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔آپ کا شمار مالدار ترین اصحاب رسول ﷺ میں ہوتا ہے۔آپ ﷺ کے عہد میں انہوں نے شادی کی، جب دوسرے دن آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کے کپڑے پر زردی دیکھی (جسے عموما عورتیں استعمال کرتی تھی) آپ ﷺ نے پوچھا:''ما ھذا؟ قال :تزوجت امراة! قال: ما اصدقتھا؟ قال: وزن نواة من ذھب ، قال: بارك الله لك، اَولم ولو بشاة'' حضرت عبدالرحمٰن بن مہاجر صحابی ہے۔آپ ﷺ کا عہد ہے۔آپ ﷺ موجود ہیں۔دیگر انصار ومہاجرین سب مدینہ میں ہے، جن کے باہمی محبت اور اخوت و بھائی چارگی کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی ہے۔قرآن میں ارشاد ہے:''رحماء بینھم'' ایک دوسرے کے لئے رحم دل ہیں۔مدینہ کے مالدار ترین صحابی نے شادی کی ہے اور کہیں کوئی

چرچا اور نمود و نمائش نہیں ہے۔ مدینہ میں کوئی اعلان یا پوسٹر نہیں لگایا گیا اور نہ ہی معاشرہ اور سماج کے ڈر سے بارات نکالی گئی۔ نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق شادی کی رسم ادا کی گئی کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں خرچ کم ہو۔

نکاح میں وجہ ترجیح

قال النبی ﷺ تُنکح المراۃ لاربع، لمالھا و لحسبھا و لجمالھا و لدینھا، فاظفر بذات الدین" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چار وجوہات کی بنا پر عورتوں سے شادی کی جاتی ہے۔ مال و دولت، حسب ونسب، خوبصورتی اور تدین۔ آپ ﷺ نے دیندار کو ترجیح دینے کا حکم دیا ہے۔ اگر کسی میں یہ چاروں خوبیاں پائی جائیں تو "**نور علی نور**" ورنہ ترجیح دیندار کو دی جائے گی۔ محض مال و دولت، حسب و نسب یا خوبصورتی بغیر دینداری کے مطلوب نہیں ہے۔ کیونکہ جنت جیسا گھر بنانا کافی نہیں ہے بلکہ اس گھر کو جنت بنانا ضروری ہے، اور جنت جیسا سکون دینداری پر محمول ہے، اس کے بغیر قلبی سکون میسر نہیں آسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**الا بذکر اللہ تطمئن القلوب**" ہمارے معاشرہ میں نکاح کے لئے وجہ ترجیح کیا ہے، اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اصحاب فکر و نظر کو اس سمت میں پیش قدمی کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح شادی کے لئے ڈگریاں اور خاندانی جاہ و جلال کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ دینداری کو پیش نظر رکھا جائے، کیونکہ دینداری کی صورت میں کامیابی و کامرانی اور خوشگوار زندگی کا وعدہ نبی کریم ﷺ کی حدیث سے ثابت ہے۔

ہماری ذمہ داریاں

اسلام میں نکاح کی اہمیت و فضیلت کو بہت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن معاشرتی طور پر ہمیں نکاح کی اہمیت و فضیلت کو عوام الناس کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ نکاح کے باب میں جن خوبیوں کو نبی کریم ﷺ نے وجہ ترجیح قرار دیا ہے، ان کی اہمت و فضیلت کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ ان تمام مسائل پر سیر حاصل بحث کرنے کے لئے ہفتہ واری جمعہ کے بیانات کو استعمال کیا جاسکتا ہے، یا پھر جن علاقوں میں جو مناسب طریقے اپنائے جاسکتے ہیں ان کے ذریعہ عوام الناس کو اس جانب ترغیب دینے کی ضرورت ہے۔ جب تک عوام کی ذہن سازی دنیا و آخرت کے فوائد و نقصانات کو سامنے رکھ کر نہیں کی جائے گی، بے راہ روی کا خطرہ برقرار رہے گا۔ مسلمان کا ہر عمل عبادت کی نیت سے ہونا چاہئے۔ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، شادی بیاہ تمام دنیاوی معاملات کو رضائے الٰہی کے لئے انجام دینا چاہئے۔ نیتوں کے بدلنے سے اعمال کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ اگر اللہ کی خوشنودی کے لئے معاملات کیے جائیں گے تو ان میں اللہ کی نصرت شامل حال رہے گی۔

❁ .... ❁ .... ❁

قسط (۲)

محسنِ انسانیتؐ کی سیرت اور اس کی جامعیّت

مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی ❖

مغرب اپنا نقطۂ نظر بدلے

افسوس ہے کہ مغربی قومیں جن کے قبضے میں آگے چل کر اس عقلی و جمہوری دور کی باگ ڈور آئی، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمی پیغام اور اس کے پیش کردہ نظام کو نہ سمجھ سکیں، وہ ہستی جس کا کارنامہ مغرب کی نشاۃِ ثانیہ کے پسِ منظر میں جگمگا رہا ہے اور وہ ہستی جو جمہوریت اور بین الاقوامیت کے پردوں کے پیچھے مسکرا رہی ہے اور وہ ہستی جس کا ہاتھ مذہبی اصلاح کی تحریک کے ڈور ہلانے والا تھا اس کو یورپ کا روشن دماغ انسان دیکھ سکا اور نہ سمجھ سکا۔ پھر یہ ظلم ڈھایا جاتا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کیے ہوئے پیغام کا مطالعہ جڑ سے شروع کر کے ٹہنیوں اور برگ و بار تک نہیں پہنچایا جاتا بلکہ بنیادی نظریہ کو سمجھے بغیر اور فکر کی جڑ کی اصلیت متعین کیے بغیر مناظرہ باز پادریوں کے چکّر میں پڑ کر جزئیاتی مسائل کی چند کونپلوں کو لے لیا جاتا ہے، مثال کے طور پر داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تعدّدِ ازدواج کو (کئی شادیوں کو) جائز رکھا۔ مذہب کیلئے تلوار اٹھائی۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز قرار دیا اور فلاں موقع پر یوں کیا اور فلاں معاملہ میں یوں کیا۔ یہ مطالعہ کا طریقہ ہمیشہ متعصب اور مخالفانہ ذہن کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کے ذریعے کسی نظامِ زندگی کو اور کسی دین کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ بلکہ اس کے ذریعے تو بات کو سمجھنے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اس کے بجائے محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اسکی تعلیمات کا مطالعہ تفصیلات کے ساتھ کیا جاتا تو یقیناً خود رَدو تنقیصات پیش نہ کی جاتیں اور اہلِ مغرب کو دھوکے وفریب میں نہ رکھا جاتا۔ مغرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدادِ ازدواج پر بلاوجہ اعتراض کرتا ہے تو اس کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ خود اہلِ مغرب وہاں کی دوشیزاؤں اور نازنینوں کی عفّتوں اور عصمتوں کو تار تار کر رہے ہیں رات و دن عیّاشی وفحّاشی کے بازار گرم کیے رہتے ہیں، وہاں کے مرد و زن شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ اپنے من پسند مرد یا عورت کے

❖ صدر مدرسہ انصار العلوم، بنگلور

ساتھ جنسی تعلقات قائم رکھنے میں آزاد ہیں، شوہر اپنی بیوی پر اعتراض کرسکتا ہے نہ بیوی اپنے شوہر پر اعتراض کرسکتی ہے، اس قدر جنسی بے راہ روی کا ماحول چھایا ہوا ہے اور یہ بے تکا استدلال بھی کیا جاتا ہے کہ عورت اپنے جسم کی مالک ہے اور اس کو نعوذ باللہ جنسی تسلی جہاں بھی میسّر ہو فائدہ اٹھا سکتی ہے اور اس کا یہ حق ہے اور مرد بھی آزاد ہے جس عورت پر اُس کا دل آجائے وہ اس سے جنسی لطف اٹھا سکتا ہے، کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہ ہوگا، تو مغرب پہلے اس حیوانیت و بہیمیت سے نکل کر انسانیت کو گلے لگائے۔ پہلے اپنے آپ کو سنبھالے۔ اس کے مقابلہ میں سیرتِ رسول ﷺ کو تعصب کا چشمہ اتار کر دیکھیے، یہاں شفّافیت، طہارت اور عفّت و عصمت کی حفاظت کس حیرت انگیز طریقے پر کی گئی ہے، اب رہا اعتراض کہ "جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جاتا ہے" مغرب کو یہ نظر کیوں نہیں آتا کہ رسول اللہ ﷺ نے آزادی کا پروانہ بھی قیدیوں کو عطا کیا ہے اور اس قدر اسلامی اخلاق کا نمونہ محمد عربی ﷺ نے اور آپ ﷺ کے جاںنثار اصحابؓ نے جنگی قیدیوں کے ساتھ برتا ہے کہ اس سے متاثّر ہوکر آپ ﷺ کے دست مبارک پر جنگی قیدی ایمان لے آئے کفر وشرک سے ہمیشہ کیلئے توبہ کیا، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ مسجدِ نبوی میں جس وقت بدر کے قیدیوں کو رکھا گیا تھا رسول اکرم ﷺ کو رات دیر گئے کسی تکلیف کا احساس ہوا تو فوراً آپ ﷺ قیدیوں کے پاس پہنچے اور ان کی تکلیف کو دور کیا راحت پہنچایا، یہ تمام سیرت کے روشن پہلو مغرب کی نگاہوں سے غائب کس لئے ہیں؟ اگر آپ ﷺ کی سیرت کی جامعیّت کا مطالعہ کیا جائے اور تعصب کے آئینہ کو اتار پھینکے تو مغرب اعتراض کرنے کے بجائے سیرت کے چشمۂ صافی کا معترف ہوگا۔ مغرب کا ایک تیسرا اعتراض یہ ہے کہ "مذہب کیلئے تلوار اٹھائی گئی" یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے، چونکہ رسول اکرم ﷺ نے جتنی بھی جنگیں لڑیں ہیں وہ اقدامی نہیں تھیں بلکہ دفاعی تھیں، خود ایک انصاف پسند انگریز مورّخ لکھتا ہے کہ "مکہ مکرمہ سے ''بدر'' کا مقام تقریباً چار سو کلو میٹر دور ہے مکہ سے چل کر کفار نے مسلمانوں پر مقامِ بدر میں حملہ کیا ہے اور مدینہ منورہ بالکل بدر سے قریب ستّر (۷۰) کلو میٹر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حملہ کفّارِ مکہ کی طرف سے ہوا ہے، دوسری جنگ ''احد'' تو بالکل مدینہ منورہ کے اندر واقع ہوئی، یہاں بھی کفارِ مکہ نے چار سو کلو میٹر دور مکہ سے مدینہ منورہ پہنچ کر مسلمانوں پر حملہ کیا ہے تو کیا یہ اقدام نہیں؟ مسلمانوں نے اور رسول اکرم ﷺ نے تو دفاع کیا ہے" دیکھئے خود انگریز مورخ نے اس معاملہ کو صاف کردیا، تو مغرب کا اعتراض جھوٹ اور افترا پردازی پر مبنی ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ پر مغرب کے دوسرے اعتراضات بھی ناقابلِ توجہ ہیں اور اسلام کو بدنام کرنے کی ناپاک کوشش ہے، حالانکہ آپ ﷺ کی سیرت اور آپ کا اسوۂ مبارکہ صاف وشفّاف آئینہ کی طرح ہے۔

(جاری)

فراقِ یارِ من

بروفات مولانا طاہرالاسلام مرحوم

ڈاکٹرعبیداقبال عاصم ❖

یکم نومبر ۲۰۲۲ء کی صبح سویرے عزیزم ضیاء الاسلام (مقیم حال سعودی عرب) کے فون سے آنکھ کھلی لیکن انھوں نے جو اطلاع پہنچائی اس کو سن کر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ روتے ہوئے بس اتنا ہی کہہ پائے کہ ''دیوبند میں رات ۲ر بجے بھائی (طاہرالاسلام) کا انتقال ہوگیا''۔ خبر ناقابل یقین تھی لیکن خبر دینے والے کی صداقت پر کسی بھی طرح کی حرف گیری نہیں کی جاسکتی تھی۔ ابھی خبر کی تفصیلات معلوم کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مساجد سے اللہ اکبر، اللہ اکبر اذان کی آواز بلند ہونے لگی۔

تذبذب کے عالم میں گھر میں ٹہلنے اور اس خبر پر اظہارِ تأسف کے علاوہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے اور کیا نہیں؟ کبھی سوچتا تھا کہ ہوسکتا ہے ضیاء الاسلام کو غلط اطلاع ملی ہو، ابھی اس کی تردید ہوجائے گی، کبھی سوچتا کہ موت تو ایک حقیقت ہے کسی کو بھی کبھی بھی کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے طاہرالاسلام واقعی دنیائے فانی سے رختِ سفر باندھ چکے ہوں۔ کیونکہ بقاء تو صرف رب العالمین کی شان ہے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح وقت گذرتا رہا۔ فجر کی نماز سے قبل ہی فون کی گھنٹیوں اور اس خبر کی شہادت مختلف حضرات سے تسلسل کے ساتھ ملتی رہی۔ فجر کی نماز پڑھ کر طاہرالاسلام اور ہمارے مشترکہ دیرینہ رفیق ڈاکٹر شبیر احمد (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی، اے ایم یو، علی گڑھ) کو اس حادثہ فاجعہ سے باخبر کیا اور فوری طور پر دیوبند کا قصد کرلیا تاکہ کاندھوں کو اپنے عزیز ترین دوست کی میت کا لمس، اس کے نمازِ جنازہ میں شرکت اور قبر پر تین مشتِ خاک ڈالنے کی سعادت حاصل ہوسکے۔ حسب پروگرام دیوبند پہنچے اور مجوزہ کاموں کو اسی ترتیب سے انجام دیا لیکن جب طاہرالاسلام کے جسدِ خاکی کو پیوندِ زمین کیا جارہا تھا تو میں بے اختیار بہنے والے اشکوں کے سیلاب پر قابو نہیں رکھ سکا۔ مجھے بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اس جسد خاکی کے ساتھ میری کم از کم پچپن سالہ یادیں زیر زمین پیوست ہورہی ہیں، یا اللہ میں کس

❖ علی گڑھ

طریقہ پر انہیں قابو میں کروں؟ بقول شاعر ؎

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

''بچپن'' سے ''پچپن تک'' یادداشتوں کا طویل ترین سلسلہ محض چند صفحات میں سمیٹ دینا مشکل کام ہے جو میرے بس سے باہر ہے۔ بس رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ کل تک واقفین اور متعلقین کو اپنی باتوں سے مسخر کرنے والا شخص اس طرح کیسے خاموش ہوگیا کہ اُس کے متعلق کچھ بھی کہا جائے اور وہ جواب دینے سے بیزار رہے؟ یہ تبھی ممکن تھا جبکہ طاہرالاسلام جیسا معلوماتی شخص قوّت گویائی سے محروم ہوجائے۔ کل تک یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ ایسا فعّال ومتحرک شخص ہمارے درمیان سے اس طرح رخصت ہوجائے گا لیکن اللہ کا نظام اسی انداز سے چلا آرہا ہے۔ ہر جاندار بلکہ کائنات کی ہر شئے کا مقدر فنا ہونا ہے۔ وقت اور مقام کا تعین کسی بھی شخص کے اختیار میں نہیں۔ رب العزت جب چاہیں تبھی اس فانی دنیا سے منہ موڑ دینا ہے۔ ہمارے پاس انا اللہ اور دعائے مغفرت کے علاوہ کوئی چارہ کار رہی نہیں۔

طاہر بھائی (پیدائش ۱۵/جولائی ۱۹۵۷ء) اور میری (پیدائش ۲۵/جولائی ۱۹۵۹ء) رفاقتوں کا سلسلہ طاہر بھائی کے دسویں اور میری عمر کے آٹھویں سال سے شروع ہوتا ہے۔ ضلع میرٹھ کی تحصیل موانہ کے قریب سٹھلہ نامی ایک گاؤں ہے جو آج سے چند برس قبل تک بھی ضلع کے دورافتادہ گاؤں میں شمار ہوتا تھا۔ وہاں پر ایک مدرسہ طاہر بھائی کے والد مولانا محمد اسلام صاحبؒ کا قائم کردہ (قاسمیہ تعلیم الاسلام) کے نام سے میرے حقیقی تایا حافظ اکرام الٰہی دیوبندی کے اہتمام میں چلتا تھا۔ مولانا اسلام صاحبؒ نے مدرسہ قائم کرنے کے بعد حافظ اکرام الٰہی صاحب اور ان کے دوست مولانا محمد سمیع اللہ قاسمی بستوی کے سپرد کردیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس ''مثلّث'' نے اپنی محنت وکاوش سے اس گھٹاٹوپ جہالت کی علامت مسلم اکثریتی علاقہ میں علم کی ایسی شمع روشن کردی تھی جس کے اُجالے سے نہ صرف پورا گاؤں بلکہ اطراف واکناف کا بیشتر علاقہ منور ہوا۔ گاؤں واطراف میں اپنی مخلصانہ خدمات کی وجہ سے بانیٔ ادارہ (بڑے مولانا) مہتمم صاحب (بڑے حافظ جی) اور صدرالمدرسین ''مولانا'' کی عرفیت سے جانے جاتے تھے۔ سٹھلہ کے اسی مدرسہ میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کرنے کی خاطر کم و بیش ڈیڑھ سال راقم نے گذارا تو انہیں ایام میں میری پہچان طاہرالاسلام سے ہوئی جو بانی مدرسہ مولانا محمد اسلام صاحب کے فرزند ہونے کی وجہ سے اساتذہ میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے، اس وقت یہاں پر بہت سے دوسرے طلباء بھی تھے جن میں ڈاکٹر رئیس احمد (سٹھلہ)، مولانا نفیس احمد (قاضی موانہ)، ڈاکٹر عبدالرؤف مرحوم (سابق خازن طبیہ کالج، دیوبند)، ڈاکٹر وصی اللہ خاں، جدہ ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ مولانا لئیق اللہ خاں (مقیم حال جدّہ)، صلاح الدین انصاری مرحوم (قومی آواز، دہلی) اور عرفان احمد خاں (مولوی عرفان میرٹھی) وغیرہ بہت مشہور تھے۔ یہ سب حضرات بالخصوص طاہرالاسلام عمر اور علم دونوں ہی میں مجھ سے فوقیت لیے

ہوئے تھے اس لیے میں نے بچپن سے ان سب کے ساتھ ’’بھائی‘‘ کا لاحقہ لگایا، اس بناء پر طاہر الاسلام کو بھی ’’طاہر بھائی‘‘ ہی کہا۔ اللہ نے ’’بھائی‘‘ کے اس لاحقہ کو قبولیت سے نوازا اور انھوں نے تمام عمر مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی مانند سمجھا۔ ابھی طاہر الاسلام عنفوانِ شباب میں قدم رکھ ہی رہے تھے کہ والدین نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دیوبند کو منتخب کرلیا اور باقی تمام تعلیم کی راہیں دیوبند میں ہی طے کی گئیں۔ مولانا اسلام صاحب کے دیوبند منتقل ہونے کے بعد یہ تعلقات ’’گھریلو تعلقات‘‘ میں منتقل ہوگئے۔ دونوں ہی گھرانے ایک دوسرے سے شیر وشکر ہوگئے۔ اس سے قبل میں بھی دیوبند آچکا تھا اور یہاں فارسی کی ابتدائی جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ ان دنوں اپنی ذہانت وصلاحیت کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند میں عربی سالِ سوم میں داخل ہوگئے۔ اس طریقہ پر اُن کا ’’بڑاپن‘‘ مزید مستند ہوگیا۔ دونوں کی راہیں جدا ہوئیں تو حلقۂ احباب بھی الگ الگ بن گئے لیکن سلام دعاء، خیر خیریت سے کبھی غافل نہیں رہے بلکہ جب کبھی اُن کے والد مولانا محمد اسلام صاحب مرحوم (متوفی اپریل ۱۹۸۷ء) یا میرے تایا حافظ اکرام الٰہی مرحوم (متوفی جنوری ۲۰۰۲ء) دیوبند تشریف لاتے تو دونوں ہی ایک دوسرے کے گھر پر حاضری ضرور دیتے جس سے دونوں خاندانوں کے مراسم مزید مضبوط ہوتے چلے گئے۔

نقل مکانی کے بعد طاہر الاسلام نے تعلیم کے ساتھ ساتھ ’’وسعتِ تعلقات‘‘ پر خصوصی توجہ دی، جس کی وجہ سے اُن کا حلقۂ احباب روز افزوں رہا۔ یہ ان کی فطری صلاحیت تھی کہ ’’نئی شہریت‘‘ کے باوجود اُن کے یار دوستوں نے انہیں ’’قدیم شہری‘‘ تصور کیا۔ اور وہ بہت جلد دیوبند کے ماحول میں پوری طرح سما کر دیوبند کے ’’شہری‘‘ کہلانے لگے۔ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم کے زمانہ میں وہ اپنی ذہانت کی بناء پر ممتاز طلباء میں شمار ہوتے تھے۔ چونکہ وہ دیوبند کے شہری مانے جاتے تھے اس لیے ان کا مقام مزید بلند تھا۔

دارالعلوم دیوبند سے طاہر بھائی کی فراغت ۱۹۷۵ء میں ہوئی تو اُس سال دورۂ حدیث میں دیوبند کے طالب علموں کی تعداد اور سالوں کی بہ نسبت کافی زیادہ تھی اس لیے شہری طلبہ اپنے ہم جماعتوں پر چھائے ہوئے تھے، اس پر طاہر بھائی کی فطری صلاحیت وذہانت نیز مطالعہ کی کثرت نے ’’سونے پر سہاگہ‘‘ کا کام کیا تھا جس کی وجہ سے اساتذہ بھی اُن کے ساتھ شفقت ومؤدت کا معاملہ فرماتے۔ درسی سرگرمیوں کے علاوہ دارالعلوم کے طلباء کے تمام معاملات میں پیش پیش رہتے۔ طلباءِ دارالعلوم کی مختلف انجمنوں، تنظیموں وغیرہ کا کوئی ضلعی یا صوبائی جلسہ ہوتا تو اکثر و بیشتر اس کی نظامت کے فرائض بھی بخوبی انجام دیتے۔ اُن کی خوبصورت نظامت طلباء کے جلسہ کی رونق بڑھا دیتی۔ برمحل خوبصورت اشعار سے وہ محفل کو گرما دیتے۔ تقریر وتحریر کا ملکہ وہبی طور پر قدرت نے عطا کیا تھا تو کسبی طور پر انھوں نے اپنے نفیس ذوق کی آبیاری کے لیے خوشخطی و کتابت سیکھ لی تھی جس کی وجہ سے وہ ایک عمدہ کاتب بھی مانے جاتے تھے۔ خوبصورت تحریر جب وہ لکھتے تو واقعتاً کاغذ پر الفاظ پھول کی مانند بکھرتے۔ ان کی تحریر کی خاصیت یہ تھی کہ جو

کچھ لکھتے اس میں حذف واضافہ کی گنجائش نہ رکھتے، نہ کانٹ چھانٹ ہوتی۔ وہ پہلے اپنے ذہن میں کوئی مضمون ترتیب دے لیتے اس کے بعد اُسے اس سلیقہ سے لکھتے کہ وہ ''حرفِ آخر'' ہوتا۔

دارالعلوم سے سند فضیلت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے لیے طب کا میدان منتخب کیا۔ اس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام ''جامعہ طبیہ'' چلتا تھا جس میں چار سالہ کورس کے بعد ''ڈپلوما ان یونانی میڈیسن''، یعنی ''حکیم'' کی سند ملتی جسے عرف عام میں ''ڈاکٹر'' سے تعبیر کیا جاتا (طاہر بھائی کے ساتھ ''ڈاکٹر'' کا سابقہ اسی ڈگری کے ساتھ لگا)۔ یہاں پر بھی اپنے امتیازی اوصاف کی بنا پر وہ سبھی استاد کی نظروں میں بہت زیادہ محبوب تھے۔ خصوصی طور پر ڈاکٹر شمیم احمد سعیدی صاحب (بانی طبیہ کالج، دیوبند) (متوفی جنوری ۲۰۱۱ء) کی جوہر شناس نظروں نے اس ''جوہر'' کے امتیازی پہلوؤں کا بخوبی اندازہ کرلیا تھا۔

طبیہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس سے قبل کہ اپنی پریکٹس شروع کرتے، اپنے نجی کاموں میں مصروف ہوگئے۔ انہیں دنوں دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کی تیاریوں کے سلسلہ میں انتظامیہ نے ان کو رضا کارانہ خدمات کا موقع دیا۔ اپنی محنت وریاضت سے انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ میں مقام بنالیا۔ اجلاسِ صد سالہ کے بہت سے کام انھوں نے بلا معاوضہ انجام دیے۔

دارالعلوم دیوبند کے قضیہ کے ابتدائی دنوں سے ہی ان کا نام بہت زیادہ نمایاں رہا کیونکہ وہ حکیم الاسلام محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فدائی دستے میں شامل تھے۔ اس قضیہ میں انہیں مخالفین کی بہت سی مزاحمتوں کا سامنا براہِ راست کرنا پڑا، یہاں تک کہ ۱۸ر ستمبر ۱۹۸۰ء کو اُس وقت جبکہ مولانا فخر الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ دارالحدیث میں کیا جارہا تھا، اُسی وقت خالی الذہن نہتے طاہر الاسلام پر قاری طیب مخالف طلبہ کے ایک غول نے جان لیوا حملہ کردیا۔ لہولہان طاہر الاسلام کو مردہ سمجھ کر مدنی گیٹ سے باہر پھینک دیا گیا۔ دیوبند، سہارن پور، میرٹھ میں مہینوں علاج کے بعد اُن کی صحت بحال ہوئی۔ اس جان لیوا حملہ سے وہ دل برداشتہ نہیں ہوئے بلکہ دارالعلوم کی اس وقت کی انتظامیہ کے شانہ بہ شانہ اور مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ اُن کے خلاف مخالفین نے بہت سے الزامات گھڑے۔ حمایتِ حق کو اپنی زندگی کا مشن بناتے ہوئے وہ مسلسل مورچہ سنبھالے رہے۔ اسی درمیان انھوں نے دہلی کو اپنا مستقر بنالیا جہاں مولانا سالم قاسمی صاحب کے داماد جناب محترم اعجاز صاحب مرحوم کے ساتھ مل کر انھوں نے بہت ہی سلیقہ کا ایک ہفت روزہ اخبار ''معرکہ'' نامی شروع کیا جس نے اُن کے صحافتی رنگ کو نکھارنے میں بہت زیادہ مدد دی۔ حالانکہ اس سے قبل وہ اپنے صحافتی ذوق کا مشاہدہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس (مارچ ۸۰ء) کے موقع پر کرا چکے تھے۔ دیوبند سے نکلنے والے پندرہ روزہ نگراسپاٹ (مدیر مسعود عثمانی مرحوم) کا دارالعلوم دیوبند نمبر ان کی صحافت کا دستاویزی ثبوت ہے۔ اس اخبار کا خاص نمبر نکالنے کے

لیے انھوں نے شبانہ روز جو محنتیں کیں اُن کا بطورِ معاون مدیر، میں عینی شاہد ہوں۔ مضامین کی فراہمی، اساتذہ ومشاہیر دارالعلوم کے انٹرویوز، دارالعلوم دیوبند کی نایاب تصاویر اور پھر ان کا ذوقِ کتابت وطباعت ہر مرحلہ پر بہت سی رُکاوٹیں آئیں لیکن انھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور ہر قسم کی دشوار گذار راہوں سے گذرتے ہوئے یہ معیاری نمبر نکالا۔ اس سلسلہ میں جتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا انھوں نے یہ سب خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اس پر مستزاد مالیات کی فراہمی یہ سب ایک طویل کہانی ہے جس کا شریک کار ہونے کی بناء پر راقم چشم دید گواہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس غیر معروف مقامی اخبار کو اپنی صلاحیت واہلیت سے ملک کے کونے کونے تک پہنچا دیا۔ دہلی سے ہفت روزہ ''معرکہ'' بھی اسی آب وتاب کے ساتھ شروع ہوا۔ اگرچہ وہ شروع میں اپنے اشاعتی پس منظر (قضیۂ دارالعلوم) کا طواف کرتا رہا لیکن بہت جلد اُس نے ترجیحات کو تبدیل کر کے قومی موضوعات وملی مسائل کا احاطہ کرنے کے سبب دہلی کے اس وقت کے معروف ہفت روزہ اخبارات میں اپنی جگہ بنالی۔

طاہر الاسلام ایک ایسا نام تھا جو اپنی نوعیت کا منفرد شخص تھا۔ میں نے انہیں عسر ویسر دونوں حالتوں میں قریب سے دیکھا۔ دونوں ہی صورتوں میں ان کا انداز ''درویشانہ'' تھا۔ تنگی کی حالت میں دوسروں کی فراخدلانہ مدد کرنے کے لیے جہاں ایک طرف وہ اپنا سب کچھ فروخت کرنے تک میں بھی کسی تردّد کا اظہار نہیں کرتے تھے تو دوسری طرف اپنی بڑی سے بڑی ضرورت کے لیے بھی وہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے۔ فیاضی ان کے مزاج کا خاصّا تھی۔ کتنی ہی پریشانی ہوتی وہ اپنی پریشانی کو کسی پر ظاہر نہ کرتے۔ ہمہ وقت اللہ سے خود بھی مانگتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔ قاسمی بیت المال کے پریشان کن دنوں میں انھوں نے ادارہ خدمت خلق کے لیے جس طرح سے دست تعاون دراز کیا اس کی مثال مشکل سے ہی ملے گی۔

اگر راقم اس بات کا اظہار کرے کہ طاہر بھائی کو جتنا قریب سے میں نے دیکھا ہے اتنا شاید کسی اور دوست نے نہیں دیکھا ہوگا تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ وہ تقریباً تمام ہی دوستوں سے بے تکلف ہونے کے باوجود کسی بھی بدتہذیبی کو برداشت نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی سے ناشائستہ گفتگو کرتے۔ ہر ایک سے بہت جلد گھل مل جانا ان کی شناخت تھی لیکن یہ نہ ہوتا کہ اس کی آڑ میں ان کے کسی قریب سے قریب تر دوست کو بھی حدود عبور کرنے کا موقع مل جائے۔ ان کی نزاکتِ طبع کا کم وبیش سبھی دوست لحاظ کرتے۔ میری پچپن سالہ رفاقت میں بے تکلفیوں کے باوجود فاصلے باقی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی انھیں بھولے سے بھی ''یار طاہر'' یا ''تو کہاں جا رہا ہے'' جیسے الفاظ کہنے کی ہمت نہیں جٹا پایا۔ حالاں کہ اگر ایسا کہا جاتا تو شاید وہ کسی بھی ردِّ عمل کا اظہار نہ کرتے لیکن چونکہ میں اُن کے مزاج سے واقف تھا اس لیے کبھی ایسا کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ ''حق گوئی'' اور ''صدق بیانی'' میں وہ کسی سمجھوتہ کے قائل نہیں تھے۔ وہ اپنے

والدین کے انتہائی فرماں بردار تھے۔ ۸۵ء میں وہ بسلسلۂ روزگار سعودی عرب چلے گئے تھے لیکن جب ان کے والد کینسر کے مرض میں مبتلا ہوئے تو وہ سب کچھ چھوڑ کر والد صاحب کی خدمت کے لیے وقف ہوگئے۔ اپریل ۸۷ء میں والد مرحوم کے انتقال کے بعد چھوٹے بہن بھائیوں کی سرپرستی دل وجان سے کی۔ وہ بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔ ان سے بڑی بہن طاہرہ باجی کی شادی مولانا اسلام صاحب کی زندگی میں ہی گنگوہ میں ہوگئی تھی، بقیہ سب بہن بھائیوں کی شادی کا فریضہ انھوں نے ہی انجام دیا۔ سب سے چھوٹے بھائی نورالاسلام نے سب بہن بھائیوں کی خواہش کے باوجود شادی نہیں کی۔ ہمدردی وغمگساری اُن کی طبیعت ثانیہ تھی۔ وہ دوستوں یاروں، پڑوسیوں، رشتے داروں، کسی کے بھی کسی دکھ درد کو سُن لیتے تو بے چین ہوجاتے اور اُس کو دور کرنے کا ہر ممکن مداوا کرتے۔ زندگی کا بیشتر حصہ دیوبند سے باہر سعودی عرب اور کچھ ساؤتھ افریقہ میں گذارا لیکن کبھی بھی وہ دیوبند سے غافل نہیں ہوئے۔ جن دنوں ٹیلی فونک رابطوں کی سہولت نہیں تھی اُن دنوں ہر مہینہ ان کا خط لازمی آتا جس میں وہ مجھ سے دیوبند کے اعزاء، اقرباء واحباب کی تمام تفصیلات معلوم کرتے۔ میں بھی ممکن حد تک انہیں تمام کوائف وحالات سے باخبر رکھنے کی کوشش کرتا۔ طویل طویل خطوط نگاری کا سلسلہ ہمارے درمیان قائم رہتا۔ ایک دفعہ ایک خط میں انھوں نے مجھے لکھا کہ ''تمہارے خط سے سبھی کے حالات معلوم ہوجاتے ہیں جن میں خوشی وغمی کے تمام پہلو ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں سورۂ کہف میں ''لا یغادر صغیرۃ و لا کبیرۃً الا احصٰہا'' کی تعبیر ان خطوط پر صادر آتی ہے۔'' دوسروں کی مدد کرنے میں انہیں قلبی سکون فراہم ہوتا۔ جن دنوں وہ رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل عمر عبداللہ نصیف صاحب کے ماتحت اس عالمی اسلامی تنظیم میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان دنوں انھوں نے ملک کے سینکڑوں دینی مدارس بشمول بڑے بڑے مدارس، عصری اداروں، نجی اداروں، تنظیموں کے علاوہ انفرادی طور پر دیوبند اور بیرون دیوبند کے بے شمار اشخاص کو وافر مقدار میں مالی امداد پہنچائی۔ حالانکہ ان میں بہت سے غیر مستحق بھی ہوتے تھے لیکن کسی کی ضرورت کو پوری نہ کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔

دیوبند سے کسی ضرورتمند کا کوئی خط جاتا تو وہ مجھ سے رابطہ کرکے اس کی ضرورت کے بارے میں خفیہ طریقہ سے تحقیقات کی ذمہ داری مجھے ہی سونپتے اور پھر جو بھی کچھ ہوتا اُسی کے مطابق وہ براہِ راست اُس شخص کی مدد کرتے۔ الحمدللہ میں بھی اپنی حد تک صحیح معلومات دینے کی کوشش کرتا حالانکہ میں ان دنوں دیوبند سے علی گڑھ آچکا تھا لیکن اپنے ذرائع سے جو بھی معلومات فراہم ہوتیں ان تک پہنچادیتا۔ مرحوم کا حلقۂ احباب وسیع تھا جس کا بنیادی سبب خوش اخلاقی، مہمان نوازی اور ہر کس وناکس کے ہر وقت کام آنا تھا۔ اکثر وبیشتر دوست اُن کی ذہانت وفطانت کے قائل تھے۔ احباب کے دائرہ میں اُن سے عمر میں بڑے بھی تھے اور چھوٹے بھی۔ وہ سب سے یکساں دوستانہ تعلق رکھتے۔ دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ میں جن اساتذہ سے اُن کا رابطہ

ہوا اُن سب نے برملا ان کی لیاقت کا اعتراف کیا۔ میرے دیوبند سے رختِ سفر باندھنے کا مرحوم کو بہت ملال تھا لیکن وہ حالات کی نزاکت اور نوعیت دونوں سے بخوبی واقف تھے۔ جن دنوں قاسمی بیت المال پر مصیبت کے بادل چھا رہے تھے انہیں دور کرنے کی انھوں نے بہت کوشش کی، لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ مرحوم کے دوبارہ سعودی عرب جانے اور میرے علی گڑھ آنے کے زمانہ میں چند ماہ ہی کا فاصلہ ہے۔ (وہ غالباً اکتوبر ۸۹ء میں سعودی عرب گئے اور میں جنوری ۹۰ء میں اتفاقاً علی گڑھ آیا جہاں بہ سلسلۂ ملازمت رک جانا میری مجبوری بن گیا) بعد میں ادارہ خدمت خلق کے زیر اہتمام چلنے والے اداروں بالخصوص قاسمی بیت المال وشہرِ طیب وغیرہ کا جو حال ہوا اُس سے ادارہ بہت زیادہ مشکلات میں گھر گیا لیکن ادارہ کے منتظم اعلیٰ مولانا حسن الہاشمی مرحوم (متوفی نومبر ۲۰۲۰ء) کی بلند ہمتی وفراخ حوصلگی اور ڈاکٹر طاہر الاسلام مرحوم کے جذبۂ تعاون نے تمام کھاتہ داروں کے بقایا جات کی ادائیگی کا فریضہ انجام دیا۔ اُس وقت یہ رقم گیارہ لاکھ روپیہ سے زائد تھی جو آج کے زمانہ میں کم ازکم ڈھائی تین کروڑ روپیہ کے برابر تھی۔ طبیہ کالج دیوبند کا ۱۹۸۷ء میں قیام عمل میں آیا تو بانی ادارہ ڈاکٹر شمیم احمد سعیدی مرحوم نے اپنے تین شاگردوں طاہر الاسلام، ڈاکٹر عبدالرؤف مرحوم (متوفی ۲۰۱۰ء) اور طبیہ کالج کے موجودہ وائس پرنسپل ڈاکٹر محمد فصیح صدیقی پر بھرپور اعتماد کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں نے ہی ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اعتماد پر پورا اترنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرکے ایک مشفق ومربی استاد کے تئیں فرماں بردار واطاعت گذار شاگرد ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

اوّل الذکر نے اس ادارہ کی ابتدائی صورتِ حال کو مالی طور پر بہتر بنانے کے لیے اپنی کوششوں کو ہندو بیرونِ ہند میں وقف کیا تو ثانی الذکر نے دیوبند میں رہتے ہوئے ڈاکٹر شمیم صاحب کے ساتھ شانہ سے شانہ ملا کر استاد کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہوئے طبیہ کالج کی تعمیر وترقی میں اہم عملی کردار ادا کیا جبکہ مؤخر الذکر نے استاد کے کہنے پر اپنی سرکاری ملازمت سے کنارہ کشی کرکے طبیہ کالج کے انتظام وانصرام کو چست درست کرنے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اندرونی تفکرات سے آزاد رکھا۔ ۱۹۸۹ء میں طاہر الاسلام سعودی عرب گئے تو یہ "نومولود" طبیہ کالج کے بچپن کا سخت ترین زمانہ تھا۔ وہ ایسا نازک پودا تھا کہ اگر اُسے بروقت پانی وکھاد فراہم نہ ہوتا تو کلملا جاتا۔ ایسے موقعے پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ہمت افزائی اور انہیں ہر ممکن آگے بڑھانے کی جو کوششیں طاہر الاسلام مرحوم نے کیں انھوں نے اس ادارہ کو "جسمانی وجود" بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اللہ تعالیٰ نے طاہر الاسلام کو جرأت وشجاعت، صاف گوئی، خلوص، نیک نیتی، حسن معاملات، سنجیدگی ومتانت اور بے تکلفی جیسے اوصاف کا بھرپور ذخیرہ عطا کیا تھا۔ وہ دورِ طالب علمی سے ہی اپنے ان اوصاف کی بنا پر مشہور تھے۔ منافقت سے کوسوں دور تھے۔ نہ تو خود منافقت کرتے اور نہ ہی اس وصف کے حاملین کو پسند کرتے۔ حق گوئی ان کا شعار تھا۔ جو بات کہتے وہ اٹل ہوتی۔ کسی سے کوئی معاملہ کرتے تو اُس

وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک کہ وہ معاملہ پوری طرح صاف نہ ہوجائے۔ کسی کو کوئی زبان دے دیتے تو پھر اُس کے لیے اپنی جان کی بھی پروانہ کرتے۔ جہاں تک مرحوم کی تعلقات کو نبھانے کی بات ہے اس کی مثال اس دور میں شاذ ونادر ہی ملے گی۔ ہر ممکن کوشش یہی کرتے کہ جس سے ان کا تعلق ہے وہ بدستور قائم رہے۔ اس کے لیے بسا اوقات انہیں بہت سی قربانیاں بھی دینی پڑتیں۔ مالی خسارے بھی برداشت کرنے پڑتے۔ وہ سب کچھ برداشت کرتے لیکن تعلقات پر حرف نہ آنے دیتے۔ اسی بنا پر وہ حلقۂ احباب میں مقبول بھی تھے۔ اکابرین واصاغرین کے سامنے وہ جب بھی کوئی بات کرتے تو بہت ہی مدلّل انداز میں کرتے۔ اس سے ان کے وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا۔ دنیا کے کسی بھی موضوع پر اور دین کے کسی بھی مسئلہ پر گفتگو ہوتی تو اُن کی معلومات کا پٹارہ کھلتا۔ وہ بے تکان گھنٹوں بولنے پر بھی قادر تھے اور لکھنے پر بھی یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی تحریر بہت ہی خوبصورت تھی۔ دیوبند سے مضبوط نسبت پر فخر کرنے کے باوجود وہ بعض موجودہ علمائے کرام کے اس رویّے پر سخت تنقید کرتے جو اُن علمائے کرام کے قول وفعل میں پایا جاتا۔ بہت سے اکابر علماء سے بھی اُن کے تعلقات کی نوعیت احترام واکرام کے ساتھ دوستانہ وبے تکلفانہ تھی، دیوبند کے بعض بزرگ شہری مثلاً مولانا راحت ہاشمی صاحب، حامد تحسین مرحوم اُن کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔

اللہ تعالیٰ نے قوتِ حافظہ زبردست دی تھی۔ آخری ملاقات کے موقع پر دورانِ گفتگو مرحوم نے صد سالہ اجلاس کے موقع پر ہماری مشترکہ اُن صحافتی کاوشوں (نگراسپاٹ کے دارالعلوم نمبر) کی یاددہانی کرائی جنھیں میرے ذہن سے محو ہوئے بھی عرصہ دراز ہوچکا تھا لیکن مرحوم کے حافظہ میں اب تک تمام باتیں موجود تھیں۔ کیا کیا لکھا جائے؟ کہاں تک لکھا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم کے ساتھ بتائے جانے والے اوقات زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں جنھیں یکجا کرنے کے لیے دفاتر درکار ہیں۔ مرحوم نے اپنے پیچھے اہلیہ، صلبی اولاد کے علاوہ چار حقیقی بہنیں (ایک بڑی طاہرہ باجی اور تین چھوٹی، شاکرہ، ذاکرہ، ناظرہ اور دو بھائی ناصرالاسلام وضیاء الاسلام، بھانجے بھانجیاں، بھتیجے، بھتیجیاں ماشاء اللہ سبھی محبت کرنے والے اور اُن کی خدمت میں ہمہ تن گوش رہنے والوں کو وافر مقدار میں چھوڑا جو سبھی اُن کے اس اچانک چلے جانے والے محبوب بھائی کے غم کا صدمہ برداشت کرنے کی ہمت نہ ہونے کے باوجود حوصلہ سے کام لے رہے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرحوم کو اپنے چھوٹے بھائی نورالاسلام کی چھ ماہ پیشتر طویل بیماری کے نتیجہ میں ہونے والی موت (متوفی ۲۱/اپریل ۲۰۲۲ء) کا بہت زیادہ غم تھا۔ اس کا اظہار مرحوم نے مجھ سے کئی مرتبہ کیا۔ جب وہ نورالاسلام مرحوم کا ذکر کرتے تو آبدیدہ ہوجاتے۔ ان کی اس وقت کی کیفیت کا تذکرہ کیا جائے تو علامہ اقبال کی زبان میں ؎

یاد سے تیری دلِ دردآشنا معمور ہے ☆ جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

کا منظر سامنے آجاتا۔ سعودی عرب جانے کے بعد اُن کی خداداد صلاحیتوں میں مزید نکھار آیا۔ اُن کی

انہی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر ایک شام نژاد شیخ نے (جو جدہ میں کسی اہم سرکاری عہدہ پر فائز تھے) اپنی دختر نیک اختر اُن کے نکاح میں دے دی جس سے اُن کی بقیہ زندگی پر مثبت ومنفی دونوں قسم کے اثرات واقع ہوئے۔ الحمد للہ، اللہ نے انہیں دو بیٹیوں اور تین بیٹوں کی دولت سے نوازا جو ابھی بھی شام اور سعودی عرب میں مقیم ہیں۔

۱۹۹۰ء کے درمیان میں ہونے والی یہ شادی شوہر وبیوی کے لیے یوں تو راحت ومسرت کا باعث ہوئی لیکن دونوں کی الگ الگ شہریت ہونے کی وجہ سے ان کے لیے بہت بڑی آزمائش ثابت ہوئی کیونکہ وہ اپنی ہندوستانی شہریت اور اہلیہ کی شامی شہریت کو نہ تو سعودی شہریت میں تبدیل کرانے میں کامیاب ہوئے اور نہ ہی اہلیہ وبچوں کو ہندوستان لانے میں کامیاب ہوسکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلیہ اپنی شہریت اور دونوں بچیوں کے مستقبل کو سنوارنے کی خاطر بادلِ ناخواستہ سعودیہ سے شام چلی گئیں۔ تینوں بیٹے مختلف روزگار سے وابستہ ہوکر سعودی عرب میں ہی مستقبل بنانے کے لیے کوشاں ہیں اور طاہر بھائی کو بحالتِ مجبوری ساؤتھ افریقہ کو ''میدانِ عمل'' بنانا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اگرچہ کبھی کسی سے اپنے اس اندرونی کرب کا اظہار نہیں کیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اہل وعیال کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود وہ اس نعمت کی حقیقی خوشیوں سے محروم رہے اور کوئی بعید نہیں کہ یہ ''اَن کہی'' باتیں ہی اُن کے حسّاس قلب پر اثر انداز ہوکر انہیں ترک دنیا پر مجبور کرگئی ہوں۔ اس معاملہ میں راقم نے جب بھی ان کے خیالات کو جاننے کی کوشش کی تو مجملاً ''الحمد للہ سب ٹھیک ہے'' سننے پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ آخری ملاقات (۲۳/اکتوبر) کو بھی دورانِ گفتگو، میں نے اس مسئلہ کو چھیڑا تو انھوں نے حسب معمول کنارہ کشی کی لیکن پھر اپنے مستقبل کے منصوبوں میں دیوبند کو ''عملی کارگاہ'' بنا کر بیوی بچوں کو یہیں لاکر بسانے کا ذکر برسبیل تذکرہ کردیا۔

رابطۂ عالم اسلامی سے ڈاکٹر عمر عبداللہ نصیف صاحب کے رخصت ہوجانے کے بعد کافی طویل عرصہ تک طاہر بھائی جدہ میں ہی جدوجہد کرتے رہے لیکن جب رہائشی مشکلات نے سعودی عرب کی زمین ان کے لیے تنگ کردی تو انھیں مجبوراً جوہانسبرگ (ساؤتھ افریقہ) کا عزم کرنا پڑا۔ اس درمیان مرحوم نے دیوان امام شافعی اور دیوان امام علی کا سلیس اردو میں ترجمہ کرکے علمی حلقوں میں شہرت حاصل کرلی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے علم لغات میں ''معجم الاضداد'' (عربی سے عربی) اور پھر بعد میں (عربی سے اردو) ترتیب دے کر اہل علم وادب سے عربی زبان وادب پر اپنی مضبوط گرفت کی تصدیق کرالی تھی جس کی وجہ سے بہت سے علمی ادارے ان کی خدمات مستعار لینا چاہتے تھے لیکن چونکہ ان کا ہدف اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ کرنا تھا اس لیے انھوں نے ساؤتھ افریقہ کو ترجیح دی اور وہاں پر وہ عربی کی مختلف کتابوں کے ترجمہ کرنے پر مامور ہوگئے، ان میں دیوان حسّان بن ثابت کا اردو ترجمہ اور عالمِ عرب کے مشہور عالم شیخ عوّامہ کی عربی کتاب ''معالم ارشادية'' (لصناعة طالبعلم) کا اردو ترجمہ (طالب علم کی کردار سازی

کے لیے) ''رہنما خطوط'' کے نام سے مکمل کر چکے تھے۔ (جو ابھی زیر طبع ہیں)

طاہر بھائی کی قسمت کہ ساؤتھ افریقہ جانے کے بعد عالمی وبا (کووڈ ۲۰۱۹ء) نے پوری دنیا کو اپنی چپیٹ میں لے کر زندگی کو ساکت وجامد کر دیا۔ وہ ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماند'' کی مانند ساؤتھ افریقہ میں رکنے پر مجبور ہو گئے۔ اس درمیان گھنٹوں واٹس ایپ پر گفتگو ہوتی جس میں وہ جلد ہی انڈیا واپس آنے کی خواہش کرتے لیکن حالات سازگار نہ ہونے کے باعث ہندوستان آنے میں تاخیر ہوتی رہی۔ اسی کشمکش میں خاصا وقت لگ گیا۔ وہ وہاں پر تصنیفی خدمات انجام دیتے رہے۔ کم وبیش تین سال کے بعد انھوں نے وطن مالوف کا رُخ کیا تو حسب دستور اپنے پروگرام سے مجھے مطلع کیا۔ میں ان دنوں اہلیہ کے ساتھ حج کے مقدس سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ واپسی پر طاہر بھائی سے ملاقات ہوئی تو ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ اب اپنی زندگی سے تھک چکے ہیں اور احباب واعزّا کے بے تکلف ماحول میں قیام کے خواہش مند ہیں لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش تماشائی بن کر رہنا ان کی فطرت کے عین مخالف تھا، اس لیے وہ یہاں پر کوئی دیرپا کام کرنا چاہتے تھے۔

اس سلسلہ میں اُن کے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے جن میں وہ ترجیح ''ادارہ سازی'' کو دے رہے تھے۔ میری مرحوم کے ساتھ گذشتہ چار مہینوں میں مسلسل ٹیلی فونک رابطوں کے علاوہ چار پانچ طویل میٹنگیں بھی ہوئیں جن میں انھوں نے بتایا کہ وہ سالِ رواں میں دہلی اور مغربی اتر پردیش کے سنبھل، مراد آباد، مظفر نگر اور دیوبند میں ایسے عصری تعلیمی ادارے قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں پر نئی نسل کی اسلامی پود تیار ہو سکے اور یہ ادارے معیاری تعلیم کے ساتھ ساتھ بہترین تربیت گاہ بھی ہوں اس لیے انہیں طالب علموں کو داخلہ دیا جائے جو قیام بھی یہاں ہی کریں تاکہ یہاں کے طلباء دینی ودنیوی علوم کا حسین امتزاج ہوں۔ اور یہ سب کام چندہ پر منحصر نہ ہو بلکہ معقول فیس کے عوض اس فریضہ کو انجام دیا جائے۔ اس کے لیے بہت سے ایسے سرمایہ دار، ان کے رابطہ میں تھے جو اس دیرپا، صبر آزما کام میں مالی تعاون دے کر اس تعلیمی تحریک کا حصہ بننے کے خواہش مند تھے۔ اگرچہ اس قسم کے تعلیمی اداروں سے کسی مالی منفعت کی فوری طور پر کوئی توقع نہیں تھی لیکن مستقبل میں یہ نفع بخش کام تھا۔ اسی وجہ سے سرمایہ دار حضرات اس کام کے لیے تیار تھے۔

مرحوم سے میری آخری ملاقاتیں اکتوبر کے آخری ہفتہ (۲۰ تا ۲۳ اکتوبر) دیوبند میں تسلسل کے ساتھ بہت تفصیل سے ہوئیں جن میں مرحوم نے ادارہ سازی کے علاوہ دیوان حسّان بن ثابت کے اردو ترجمہ نیز شیخ عوامہ کی عربی کتاب ''**معالم ارشادیہ**'' کے اردو ترجمہ ''رہنما خطوط'' کی کمپوزنگ، طباعت واشاعت سے متعلق بھی تفصیلی گفتگو کی۔ حسب عادت انھوں نے ناشرین کی کمپوزنگ میں پروف ریڈنگ کے تعلق سے غیر سنجیدگی کی شکایت کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس مسوّدہ پر ایک نظر میں بھی ڈال لوں۔ میں نے اگلے ماہ دیوبند آنے کا وعدہ کرتے ہوئے اس موقع پر اس کام کو کرنے کا عندیہ دیا جسے انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔

۲۹/اکتوبر (وفات سے تقریباً ۳۶ گھنٹہ قبل) مرحوم سے آخری گفتگو ہوئی جس میں انھوں نے بتایا کہ ’’اس وقت وہ ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کی غرض سے دہلی جارہے ہیں۔ واپس آنے کے بعد نومبر کے پہلے ہفتہ میں چندروز علی گڑھ قیام کا دل چاہ رہا ہے‘‘ میں نے انہیں اس ارادہ پر ہی دلی مبارک باد پیش کرتے ہوئے ازراہِ مذاق کہا کہ ’’اس دفعہ وعدہ پورا ہونا چاہیے‘‘۔ اس سے قبل کہ وہ وعدے کو پورا کرتے رب ذو الجلال والاکرام نے ان کی سانسوں کی مقدار کو پورا کرکے ’’**اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعة ولایستقدمون**‘‘ کی حقانیت کو ہماری آنکھوں کے سامنے کردیا۔ وقت موعود سے کچھ ساعتوں قبل ہی انہیں اس کا اندازہ ہوگیا تھا کہ ’’وہ اپنے مالک حقیقی سے ملنے جارہے ہیں‘‘ تبھی تو انھوں نے رات میں ساڑھے بارہ بجے کے قریب اپنے عزیز بھانجہ طلحہ میاں کو اٹھایا اور ان سے یٰس شریف اور منزل پڑھنے کا اصرار کیا اور یہ بھی کہا کہ ’’اب میں بچنے والا نہیں ہوں، تم بہن بھائیوں کو اطلاع کردو‘‘، خود بھی وہ کلمہ و یٰس کا ورد کرتے رہے اور اسی میں جان، جان آفریں کو سپرد کردی اور ظاہری طور پر وہ اس ’’**نفس مطمئنه**‘‘ کے مصداق ہوگئے جس کے تعلق سے قرآن نے خوشی خوشی اپنے رب کی طرف لوٹ جانے کو کہا ہے اور اُس کو ’’**فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی**‘‘ کی بشارت سے نوازا ہے۔ مرحوم کی انسانیت نوازی، خوش خلقی، ہمدردی، غم گساری، ملنساری، جذبۂ تعاون و خیرخواہی، خدمتِ خلق، غرباء پروری جیسے اوصاف کی بنا پر اللہ رب الکریم سے یہی توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز وہ جنت میں مقامِ فردوس میں قیام پذیر ہوں گے۔

اے رب کریم! اپنے فضل و کرم سے نہ صرف طاہر بھائی کے لیے بلکہ ان کے جملہ متعلقین کے لیے (جن میں لکھنے والا بھی شامل ہے) بھی آخرت کے تمام مراحل کو آسان سے آسان تر فرما اور وہاں کی ان تمام نعمتوں اور انعامات سے نواز دے جو تو نے اپنے نیک بندوں، صلحاء، شہداء و متقین کے لیے مخصوص کررکھی ہیں۔ اے پروردگار عالم! مرحوم کے تمام پسماندگان و متعلقین کو صبر جمیل عطا فرما۔

اے اللہ ان کی خدمات کو قبول فرما، سیئات سے درگذر فرماکر انہیں حسنات میں تبدیل فرماکر اجر عظیم سے نواز دے۔ آمین یا رب العالمین! تاریخی طور پر اس واقعہ کو میرے لیے ہی نہیں بلکہ تمام متعلقین کے لیے ’’غمگین، المناک واقعہ‘‘ قرار دیا جاسکتا ہے جس سے مرحوم کے ہجری سنہ وفات ۱۴۴۴ کی تخریج ہوتی

۱۴۴۴ھ

ہے۔ اب تو بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ

زندگانی تھی تیری مہتاب سے تابندہ تر ☆ خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا ☆ نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ☆ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے



آخری قسط

مدارس اسلامیہ میں عصری علوم وفنون

اورخطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کا موقف

مولانا سیف الرحمٰن ندوی ❖

مدارس اسلامیہ میں علوم جدیدہ کے سلسلہ میں حضرت خطیب الاسلامؒ کا موقف

اس سلسلہ میں حضرتؒ کا موقف ان کی تحریر وتقریر سے کچھ اس طرح واضح ہوتا ہے کہ ان قدیم اداروں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اوران سے چھیڑ چھاڑ نہ کیا جائے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ: ''آج ہمارے یہ مدارس جو اپنی متواضعانہ صورت میں موجود ہیں، جن کے پاس نہ بے تحاشہ پیسہ، نہ بلڈنگیں اور نہ کوئی ساز وسامان ہیں، نہ کروفر؛ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود ملت کی بقاء اورملت کا امتیازی وجود انہیں سے قائم ہے، اس دورحاضر میں ان مدارس کا قیام اوران کی بقاء اہم دینی ضرورت ہے، بلکہ آج وقت اور حالات نے ان کو ایک سیاسی ضرورت بھی بنادیا ہے، اورقومی وملکی ضرورت بھی بنادیا ہے"(۱)

چنانچہ موجودہ مدارس کے نصاب ونظام میں کوئی بڑی تبدلی کیے بغیر جدید طرز کے ایسے مدارس قائم کیے جائیں جن میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ جدید علوم وفنون بھی پوری اہمیت کے ساتھ پڑھائے جائیں،اور یہ کام بڑی آسانی سے ہوسکتا ہے؛ چونکہ پورے سال کے تعلیمی ایام واوقات اورسال بھر میں ہونے والی چھٹیوں کا صحیح تناسب اگرنکالا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پورے سال میں دینی اداروں میں جہاں تقریباً ساڑھے آٹھ ماہ تعلیم ہوتی ہے، وہیں عصری اداروں میں صرف پانچ ماہ، پھر یہ کہ مدارس میں تعلیمی گھنٹے جہاں پورے ساٹھ منٹ کے ہوتے ہیں، وہیں عصری اداروں میں تعلیمی گھنٹے زیادہ سے زیادہ پینتالیس منٹ کے ہوتے ہیں؛ بلکہ اس سے بھی کم۔

❖ استاذ جامعہ رحمانی، مونگیر

(۱) خطیب الاسلام مولانا محمد سالم قاسمیؒ، خطبات خطیب الاسلام، جلد۱،ص ۸۵

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان اداروں کے مقابلہ میں اہل مدارس اپنے بچوں کا تقریباً دوگنا وقت لیتے ہیں، لہذا علماء امت اور ارباب مدارس کو چاہیئے کہ مدارس دینیہ کے لیے بابصیرت وتجربہ کار افراد اور دیگر ماہرین تعلیم کو شامل کر کے ایک ایسا نصاب تیار فرمائیں، جس پر دینی رنگ غالب ہو، جو قدیم صالح اور جدید نافع کا جامع ہو، جس کے اندر اضافی فنون اور مکررات کو چھوڑ کر لازمی دینی کتب حسب ضرورت، بعض پوری اور بعض کے منتخبات، اس طرح شامل کیے جائیں کہ مدارس کے طلبہ سے لیے جانے والے اوقات میں سے نصف وقت میں وہ پورے ہوجائیں، اور نصف وقت میں علوم عصریہ کا سرکاری طور پر منظور شدہ مروج نصاب انگلش میڈیم کے ساتھ متدین پروفیسر حضرات کے ذریعے پڑھایا جائے، اس لیے کہ جس طرح امت کو اچھے عالم دین، ماہر مفتی اور تجربہ کار قاضی کی ضرورت ہے، اسی طرح اچھے انجینئر، ماہر ڈاکٹر اور دیانت دار وکیل وغیرہ کی بھی ضرورت ہے۔

حضرت خطیب الاسلامؒ کے پیش کردہ طریقہ کو پڑھنے اور جاننے کے بعد کچھ اس طرح کے نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

۱۔عصری علوم وفنون کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ہمارے طلبۂ مدارس اسلامیہ کو بھی ان علوم یعنی علوم جدیدہ سے لیس ہونا چاہیئے۔

۲۔اس کام کے لیے مدارس اسلامیہ کے نظام ونصاب میں کسی بڑی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف ابتدائی درجات میں اضافی فنون اور مکررات کو حذف کر کے لازمی دینی کتب حسب ضرورت، بعض پوری اور بعض کے منتخبات، اس طرح شامل کیے جائیں کہ مدارس کے طلبہ سے لیے جانے والے اوقات میں سے نصف وقت میں وہ پورے ہوجائیں، اور نصف وقت میں علوم عصریہ کا سرکاری طور پر منظور شدہ، این، سی، آر، ٹی، کا مروج نصاب ماہر اساتذہ حضرات کے ذریعے پوری توجہ کے ساتھ پڑھایا جائے۔

۳۔انٹر تک کی عصری تعلیم کے لیے جدید طرز کے نئے ادارے قائم کیے جائیں اور اس کے لیے بھی ایسا نصاب تعلیم تیار کیا جائے جس سے دینی ضرورت بھی پوری ہو اور عصری تقاضوں کی بھی تکمیل ہوسکے اور اس نصاب سے فارغ ہونے والے طلبہ کو ہم انٹر کے سرٹیفکٹ کے ساتھ عالم کی بھی سند دیں۔

یہ تھا وہ خاکہ جو انھوں نے پیش فرمایا تھا، اور جہاں تک اس عمل کی بات ہے تو پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ۱۹۶۶ء میں جامعہ دینیات کا قیام بھی حضرتؒ نے اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے کیا تھا، کہ اس وقت مدارس اسلامیہ میں مروج نصاب تعلیم میں اس جزوی تبدیلی کے لیے بھی ماحول سازگار نہیں تھے، اس خیال سے کہ جب ادھر کا ماحول سازگار نہیں ہے تو کم از کم عصری اداروں کے طلبہ و

طالبات کے لیے ہی دینی تعلیم کا نظم کر دیا جائے۔

چنانچہ عالمی سطح پر ملت کے نوجوانوں کو ان کی مادی ترقی میں کسی رکاوٹ کے بغیر دینی و اخلاقی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے یکم جنوری ۱۹۶۶ء میں جامعہ دینیات کے نام سے دیوبند ہی میں ایک ادارہ قائم فرمایا؛ تاکہ ملت کے نوجوانان ماہر ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر اور قابل وکیل بننے کے ساتھ ساتھ صحیح العقیدہ، اچھے اور سچے مسلمان بھی بن سکیں۔ مزید یہ کہ اسی طرح حضرتؒ نے اہل مدارس کو آلات جدیدہ کے استعمال کی طرف بھی متوجہ کا کیا تھا اور فرمایا تھا کہ دینی جامعات اور مدارس اسلامیہ کے ذمہ داروں کو چاہیے کہ انٹر نیشنل وسائل علم وخبر ''کمپیوٹر'' اور ''انٹرنیٹ'' کو تعلیم وتربیت اور دعوت وتبلیغ کے لیے استعمال کریں؛ کیوں کہ ان کے ذریعہ سے اپنی تعلیمی وتربیتی جدوجہد کی افادیت کو عام کرنے میں اور صحیح فکر وعقیدہ کی اشاعت میں ان کو بڑی حد تک مدد مل سکتی ہے اور اس سے ملت وامت کو کافی مستفید کر سکتے ہیں، اور یہ بات حضرتؒ نے اس وقت فرمائی تھی جب انٹرنیٹ اور کمپیوٹر وغیرہ سے عام لوگ تقریباً ناواقف تھے۔

خلاصہ یہ کہ ان حالات میں اہل مدارس کو حضرت خطیب الاسلامؒ کے کھینچے ہوئے ان خطوط پر چلنا چاہیے، اور اسے اپنا کر بآسانی دونوں ضرورتوں کو پورا کرنا چاہیے، ویسے مزید غور وخوض کرنا چاہیں تو اس کے لیے بھی دروازہ کھلا ہوا ہے، غور وخوض کریں، مشورہ کریں اور جس نظام ونصاب کو اپنانا چاہیں اپنائیں، اگر اسی قدیم نظام میں داخل کرنا ہے تو ابتدائی درجوں میں تو عصری علوم کی کتابیں داخل نصاب ہیں ہی، اسی نظام کو تھوڑا چست درست کر دیں اور بس۔

بہتر یہ ہے کہ جدید انداز کے ادارے قائم کریں، اور اس کے لیے نیا نصاب تیار فرمائیں، اسکولینگ اور انٹر کے بعد کی تعلیم کے لیے دیگر عصری دانش گاہیں موجود ہیں، جہاں ہمارے مسلم بچے جاتے بھی ہیں، ہمارے یہ طلبہ بھی وہاں جائیں اور اعلی عصری تعلیم سے خود کو لیس کریں، عصری علوم وفنون کی بھی اپنی اہمیت ہے اور ضرور ہے؛ لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں بھولیں کہ یہ مدارس ہیں، انہیں مدارس ہی رہنے دینا اپنے دینی وجود کے لیے بے حد ناگزیر ہے۔

مدارس اسلامیہ سے بے جا مطالبہ

اگر یہ مدارس ختم ہو گئے تو ہندوستان سے مسلمانوں کا نام ونشان بھی مٹ جائے گا اور ایک لال قلعہ اور تاج محل کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا، جس کی نظیریں دنیا میں موجود ہیں، اس لیے مسلمان کسی قیمت پر یہ نہیں چاہیں گے کہ ان کے یہ مدارس اسکول بن جائیں، اس لیے کہ یہ مدارس عصری علوم وفنون کی ترویج و اشاعت کے لیے نہیں قائم کیے گئے ہیں، ان کے قیام کے مقاصد الگ ہیں اور الحمدللہ جن مقاصد کے لیے

یہ قائم کیے گئے ہیں یہ ان میں کامیاب بھی ہیں۔

چنانچہ مدارس اسلامیہ سے باضابطہ دسویں کلاس تک کی عصری تعلیم کا مطالبہ کرنا بے جا اور نا مناسب ہے؛ بلکہ ملک کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے اور یہ بالواسطہ مدارس کو ختم کرنے کی سازش ہے، یہ کوئی معمولی تبدیلی کا مطالبہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ بہت بڑی تبدیلی ہے، جو کافی غور وخوض کی متقاضی ہے، لہٰذا اہل مدارس کو غور وتامل کے بغیر حالات کے رخ پر بہنا نہیں چاہئے؛ بلکہ کافی سوچ سمجھ کر فیصلہ لینا چاہئے۔

ایسا نہیں ہے کہ عصری تعلیم سے ہمیں کوئی نفرت ہے یا اس کی ضرورت کا ہمیں اعتراف نہیں ہے، پورے ملک میں بہت سے عصری ادارے ہیں، جہاں عصری تعلیم ہوتی ہے اور کوئی بھی کہیں بھی جاسکتا ہے، جہاں چاہے وہاں سے تعلیم حاصل کرسکتا ہے، اور مسلم نوجوان بڑی تعداد میں ان اداروں میں جاتے ہی ہیں اور جاکر تعلیم حاصل کرتے ہیں، اور جو طلبہ ہمارے یہاں آتے ہیں، وہ کافی کم تعداد میں ہوتے ہیں؛ لیکن ان کے لیے بھی ہم نے مدارس میں ابتدائی درجوں میں ان علوم کو شامل کررکھا ہے اور اگر اس سے بھی نہیں ہوگا تو ہم جدید طرز کے ادارے قائم کریں گے اور وہاں مکمل اسلامی ماحول میں عصری تعلیم دیں گے؛ لیکن یہ نہیں ہوگا کہ ہم آپ کے دباؤ میں آکر مدارس کو اسکول بنادیں۔

حرف آخر

چنانچہ اخیر میں ارباب مدارس سے عرض ہیکہ کسی کے دباؤ میں آکر کوئی فیصلہ مت کیجئے اور صاف کہہ دیجئے کہ ہمارے موجودہ مدارس میں اسکولی تعلیم کی کھوج اور ان سے اس کا مطالبہ غلط ہے، یہ ادارے دینی و مذہبی تعلیم کے ادارے ہیں، ان کا مقصد دینی ضروریات کی تکمیل ہے، اور اس کی کھلی اجازت ہمیں ہمارے ملک کا آئین دیتا ہے، یہ آزاد ہندوستان کی سیکولر تصویر ہے، اس سے چھیڑ چھاڑ مت کیجئے، اگر آپ کو اصلاح ہی کرنی ہے تو پہلے سرکاری اسکولوں کو ٹھیک کیجئے، کالجوں کا حال معلوم کیجئے، سرکاری تعلیمی شعبوں کے حالات پر ترس کھائیے، اور اگر ہماری طرف ہی توجہ دینی ہے تو مدرسہ بورڈ اور دیگر اقلیتی اداروں کی اصلاح کیجئے، بقول مولانا سید محمد ولی رحمانیؒ آپ کو مدارس میں پڑھنے والے محض چار فیصد مسلم طلبہ ہی کی فکر کیوں دامن گیر ہے؟ چھیانوے فیصد مسلم طلبہ کی فکر کیوں نہیں ہے؟

بہر کیف: اس موقعہ پر اقبال علیہ الرحمہ کا یہ اقتباس بھی ضرور پڑھنا چاہئے، وہ کہتے ہیں کہ:

"جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی، میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا جو تم چاہتے ہو، انقلاب، ایسا انقلاب، جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کردے۔

یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی،۔۔۔ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو ان ہی مکتبوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملّا اور درویش نہ رہے، تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو ہوگا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہوگئے، تو بالکل اسی طرح، جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا"۔

لٰہذا میں ارباب مدارس سے کہتا ہوں کہ قطعا مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اس نظام اور ہمارے اس موجودہ نصاب نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے اور ان ہی نظام اور نصاب کو اپنانے کی وجہ سے آج ہم موجودہ دینی و اسلامی رنگ میں نظر آرہے ہیں جو مخالفین اسلام کو بے چین کیے ہوا ہے۔

یہ بات خوب یاد رکھی جائے کہ دینی تعلیم کے حصول کا مقصد طلبِ دنیا نہیں ہے، اور نہ ہی طلبِ دنیا اور دنیا کی ترقیات ہمارے نزدیک محمود ہیں، بھوک سے تڑپنے میں اور پیٹ پر پتھر باندھ کر دوسروں کو کھلانے میں ہمیں جو مزہ آتا ہے، اہل دنیا اس سے ناواقف ہیں، چنانچہ ہمیں اپنی حالت پر رہنے دو، ہم بھوک میں تڑپیں گے اور روٹی دوسرے ضرورت مندوں کو دیں گے، ہم پیاس سے تڑپیں گے، جانیں دیں گے اور پانی کا گھونٹ اپنے بھائی کو پلائیں گے، یہی ہماری پہچان ہے، ہم جنوں کی جس دنیا میں رہتے ہیں، وہاں کی کامیابی کا معیار الگ ہے، وہاں کی ترقیات کے اسباب مختلف ہیں، جہاں اس پوری دنیا اور دنیا کے تمام اسباب و وسائل کی قیمت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے، چنانچہ ہم یہاں کی چمک دمک اور یہاں کی ترقیات سے راضی ہوکر اتنا سستا سودا نہیں کرسکتے، اس لیے کہ **طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّين** ہمارا تعارف ہے، **وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ** ہماری ذمہ داری ہے، **لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ** ہماری علامت ہے، **لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْض** ہماری مشغولیت کی دلیل ہے، **يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّف** ہماری شان ہے، **تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ** ہماری پہچان ہے اور **لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا** ہماری بے نیازی اور ہمارے استغنا کا ثبوت ہے، لہذا ہماری اس جماعت کو مت چھیڑو! ہمیں اپنا کام کرنے دو!



قسط (۲)

حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کا مشرکین مکہ کے نام خفیہ پیغام

مولانا محمد نعمان خلیل ❖

مقوقس کا اعتراض اور اس کا جواب

قال: أخبرني عن صاحبك أليس هو نبيا؟ مقوقس نے کہا: کیا آپ کا ساتھی (نبی ﷺ) نبی نہیں ہیں؟ **قلت: بلى! هو رسول الله** میں نے کہا: کیوں نہیں! وہ تو اللہ کے رسول ہیں۔

قال: فماله لم يدع على قومه حيث أخرجوه من بلدته.

تو انہوں نے اپنی قوم کے خلاف بد دعا کیوں نہ کی جب انہوں نے ان کو اپنے شہر سے نکالا؟

فقلت له: فعيسى ابن مريم أتشهد أنه رسول الله؟ فماله لم يدع عليهم حتى رفعه الله؟

میں نے کہا: عیسی ابن مریم (علیہ السلام) کے متعلق آپ گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، تو انہوں نے اپنی قوم کے خلاف بد دعا کیوں نہ کی؟ جب کہ وہ تو انہیں تختِ دار پر لٹکانے کا ارادہ کر چکے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان پر اٹھالیا۔

فقال: أحسنت، أنت حكيم، جاء من عند حكيم. مقوقس نے (تاثر بھرے لہجے میں) کہا: بہت خوب (جواب دیا)، آپ حکیم ودانا ہیں، جو ایک حکیم ہی کی طرف سے آئے ہیں۔

اور آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حضور ﷺ کو ہدیہ بھیجا جس میں ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالی عنہا بھی تھیں، جن سے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالی عنہ کی پیدائش ہوئی۔(۱)

آپ ﷺ کا آپ رضی اللہ تعالی عنہ کو اکیلے سفیر بنا کر بھیجنا، وہ بھی وقت کے بڑے بادشاہ کی طرف، پھر بادشاہ کا آپ سے متاثر ہونا اور کامیابی کے ساتھ لوٹنا، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو آپ رضی اللہ تعالی عنہ کی بہادری، شجاعت، اور بلند ہمتی پر دلالت کرتی ہیں۔

❖ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

(۱) أسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، ج۱، ص:۴۰۹۔

(۳) مفاد پرستی بھی سبب نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کونقصان پہنچانا چاہتے ہوں؛ کیوں کہ آپ رضی اللہ تعالی عنہ کو یقین تھا کہ فتح مسلمانوں کی ہوگی، اوران کے خبر پہنچانے سے آپ ﷺ اوران کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ جیسا کہ بعض روایات میں منقول بھی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے یہی کہا تھا۔(۱)

خفیہ خط کے الفاظ

اسی طرح سیرت کی مختلف کتب میں خط کے الفاظ موجود ہیں، جو آپ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مشرکین مکہ کو لکھے گئے تھے۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کی فتح کا مکمل یقین تھا، اوراس خط سے مشرکین کو خاطر خواہ فائدہ نہ ہونا تھا۔

وہ الفاظ یہ ہیں: **"إن النبی ﷺ قد توجه إلیكم بجیش كاللیل، یسیر كالسیل وأقسم بالله لو سار إلیكم وحده لنصره الله علیكم فإنه منجز له ما وعده"** (۲)

کہ نبی کریم ﷺ تمہاری طرف ایسا لشکر لیکر نکلنے والے ہیں، جو رات کی مانند ہے، سیلاب کی طرح امنڈتا ہوا ہے، اور بخدا! اگر آپ ﷺ اکیلے بھی تمہارے خلاف نکلیں، تو ضرور اللہ تعالی انہیں تم پر فتح دیں گے، کیوں کہ وہ ذات ان سے کیے ہوئے اپنے وعدوں کو پورا کرنے والی ہے۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ مشرکین مکہ کو حضور ﷺ کے لشکر کی خبر کم، ڈرا زیادہ رہے تھے اورانہیں مسلمانوں کی فتح کا یقین دلا رہے تھے تاکہ وہ مزاحمت نہ کرسکیں۔

خط کا بنیادی سبب

(۴) جب خفیہ خط لکھنے کا سبب کفر، ارتداد، بزدلی، اور مفاد پرستی نہیں تھا، تو وہ کیا وجہ تھی؟ جس نے آپ رضی اللہ عنہ کو یہ راز افشاں کرنے پر مجبور کیا، وہ وجہ خود حدیثِ مبارک میں موجود ہے کہ وہ مکہ میں اپنے اہل وعیال اور مال کا تحفظ چاہتے تھے، جو دیگر مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اپنی قرابتوں کی وجہ سے حاصل تھا، مگر آپ رضی اللہ عنہ اس سے محروم تھے، کیوں کہ آپ یمن سے آکر وہاں آباد ہوئے تھے، اوراہل وعیال کا تحفظ چاہنا موجبِ کفر ونفاق اور بزدلی کا سبب نہیں ہوسکتا۔

❁.......❁.......❁

---

(۱) معارف القرآن للشیخ المفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ تعالی، مکتبۃ معارف القرآن ج ۸، ص: ۴۰۱، س: ۲۰۰۸

(۲) السیرۃ النبویۃ لابن ہشام التی ملحقۃ بالروض الأنف للسہیلی المتوفی ۱۵۸، دارالحدیث القاہرۃ ج ۴، ص: ۱۶۶، س ۲۰۰۸ء-۱۴۲۹

قسط (۱۴)

علم کلام جدید

تعارف، مسائل اور مباحث: اصولِ نانوتوی کی روشنی میں

حکیم فخرالاسلام ❖

۱۰: نظریۂ دیمقراطیس: ''یونانی فلاسفہ میں **دیموقراطیس** (Democritus ۴۶۰-۳۷۰ ق م) ہے کہ ''نظریۂ ایٹم جس سے منسوب ہے۔ اس نے اِس نظریہ کی تفصیل اِس طرح بیان کی: کائنات ان گنت ذرات سے بنی ہے جو باہم متشابہ، ہم جنس، ازلی، ابدی اور خلا میں بذات خود متحرک ہیں۔ اور اشیاء کے اوصاف میں جو باہمی اختلاف نظر آتا ہے، وہ ان ذرات ہی کی حرکت اور باہم ملنے اور جڑنے کے اختلاف اور جسم میں اُن کے مراکز کے اختلاف کے باعث ہے۔ اُن کے ازلی وابدی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وجود لا وجود سے نہیں ہوتا، جیسا کہ وجود لا وجود نہیں ہو جاتا۔ اور اگر اِن کا وجود خلا میں نہ ہوتا، تو ان کے لیے حرکت ناممکن ہوتی۔ یہاں سے پھر وہ اپنے اِس قول تک پہنچا کہ: کائنات کی تین اولین حقیقتیں ہیں۔ ذرات، خلا اور حرکت۔

دیموقراطیس نے صحیح فکر سے عاری ہوکر یہ خیال کیا کہ ذرات کی حرکت ''اندھی ضرورت'' کا نتیجہ ہے جو اُنہیں حرکت کرنے، باہم جڑنے اور باہم آمیز ہو جانے پر مجبور کرتی ہے۔ اور اُس کی نظر میں یہ کائنات اور جو کچھ بھی اس میں از قسم جماد، نبات اور حیوان ہے.... کسی اندھی ضرورت کی قوت سے حرکت کرنے والے ذرات سے مرکب ہیں۔''(۱) پھر رواقی فلسفہ کا شیخ الطریقت **ابیقور** (Epiqure ۲۷۰ ق م) اپنی فکر میں بلند ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ جب ہم حواس کے آوردہ سے تجاوز کرتے ہیں، تو خطا ہی سے دوچار ہوتے ہیں۔ اِس طرح ہم حقیقت کے اسباب کے بارے میں ایسی رائے بنانے کی کوشش کرتے ہیں جو پردۂ غیب میں ہوتے ہیں۔ لیکن مابعد الطبیعات کے اِدراک میں ہماری عقلوں کے عجز کا معترف، تخلیقِ کائنات سے متعلق کلام کرتے ہوئے محتاط حکیمانہ طریقہ کو ترک کرکے ''تمام تر ظن وتخمین پر مبنی آراء کو پیش کرتا ہے اور دیموقراطیس کی رائے کو اختیار کرلیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کائنات کی اصل ذرات ہیں جو بذاتِ خود متحرک ہوتے ہیں اور یہ کہ اُن کی حرکت کی علت اُن کا ثقل ہے۔ جو اُن کے اندر موجود ہے اور وہ اپنے ثقل کے باعث اوپر سے نیچے کو حرکت کرتے ہیں اور کچھ نہ کچھ بھٹک جاتے اور گر جاتے ہیں۔'' یہ گر جانے والے ذرات'' باہم ملتے اور مرکبات بن جاتے ہیں۔ اور کلی حیات، حادثے اور اتفاق کے ساتھ باہم ملنے سے پیدا ہوئی ہے۔''

❖ فاضل درسیات، بی یو ایم ایس علی گڑھ۔ ایم ڈی یونانی جامعہ ہمدرد، دہلی

(۱) فلسفہ، سائنس اور قرآن ص ۴۷، ۵۰ تا ۵۷

اِس طرح ابیقورخود اپنی اِس شرط کہ ''حواس کے ذریعہ معلومات سے تجاوز کرنا ہمارے لیے درست نہیں۔'' پر قائم نہیں رہا اور ''وہ حیات کے حادثے اور اتفاق سے وجود میں آنے کے زعم میں مبتلا ہو گیا۔'' اب ہم کائنات کی بنیادی اینٹوں اجزائے دیمقراطیسی کے متعلق حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کی عبارت اور حل الانتباہات کی مدد سے اُس کی شرح پیش کرتے ہیں، حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی فرماتے ہیں:

دیمقراطیسی اجزاء: ''اگر کوئی شخص اجزائے مادہ کو مع الصورت قدیم مانے اور اس صورت کو صُورِمُتَنَاثِرَہ کے ساتھ بھی مجتمع مانے، اس طرح سے کہ وہ بشکل چھوٹے چھوٹے ذرّوں کے تھا جن میں قسمت عقلیہ ووہمیہ ممکن ہے، مگر قسمت فِکّیہ ممکن نہیں، جیسا دیمقراطیس بھی ایسے اجزاء کا قائل ہوا ہے۔''

ایسے ذرات جن کی تقسیم نہیں ہوسکتی۔ کائنات میں جو کچھ تغیر و تبدل نظر آتا ہے، وہ اِن ذرات کی کمی بیشی اور افتراق و اِجتماع کا نام ہے۔ یہ اجزائے دیمقراطیسی کہلاتے ہیں۔ اِن کی حقیقت ایک تمثیل کے پیرایہ میں حکیم محمد مصطفیٰ بجنوریؒ اِس طرح ذکر فرماتے ہیں: ''تقریبِ الی الفہم کے لیے اِس (اجزائے غیر منقسمہ) کی مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ فرض کرو کہ باجرہ کا ایک ڈھیر ہے۔ اُس کو کسی نے چار حصے کر کے ایک ایک حصہ کو ایک ایک رنگ سے رنگ دیا۔ ایک حصہ کو خوب گہرا زرد کردیا اور ایک حصہ کو سیاہ کردیا اور ایک کو سفید، ایک کو نیلا کردیا۔ اب وہ اُن کو ملا کر مختلف ڈھیریاں بنا کر مختلف رنگ دکھا سکتا ہے۔ اگر اِن چاروں کو برابر مقدار میں ملاتا ہے اور فرض کرو کہ اتنی دور سے دکھاتا ہے کہ باجرے کے دانے دیکھ نہ پڑیں، تو دیکھنے والوں کو ایک ایسا رنگ نظر آئے گا جو چاروں سے الگ ہے۔ اور اگر سیاہ اجزاء کو غالب رکھتا ہے، تو ایسا نظر آئے گا جو بہ نسبت پہلے کے مائل بہ سیاہی ہے۔ علیٰ ہذا جس رنگ کے اجزاء کو جس نسبت سے کم زیادہ کرے گا، مرکب میں ویسا ہی رنگ نظر آنے لگے گا۔ دیکھنے والے کی نظر چوں کہ اجزاء کو یعنی باجرہ کے دانوں کو بوجہِ دوری کے محسوس نہیں کرتی، اس وجہ سے ہر ڈھیری کو وہ یہی کہتا ہے کہ اِس ڈھیر کا کل کا رنگ یہی ہے۔ حالاں کہ واقع میں وہ رنگ موجود نہیں اور کسی جزو میں بھی وہ رنگ نہیں، یہ صرف نظر کی غلطی ہے۔ اِسی طرح کبھی وہ اُس باجرہ کے سو (۱۰۰) دانوں سے ایک ڈھیری بنا دیتا ہے، تو ایک مجسم چیز نظر آتی ہے۔ اور کبھی ہزار، دو ہزار، دس ہزار دانوں کی ڈھیری بنا دیتا ہے، تو حسبِ تعداد- دانوں کے اور اُن کے تلے اوپر یا برابر رکھ دینے کے- مختلف شکل کی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔ اِن تغیرات کو دیکھ کر یہ کہنا صحیح نہیں کہ اصل چیز بدل گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز نہیں بدلی یعنی باجرہ کے دانے وہی ہیں۔ ہر دانے کی وہی شکل اور وہی رنگ ہے جو پہلے سے تھا، صرف کمی بیشی تعداد اور اِفتراق و اِجتماع ہو گیا ہے۔ اِسی طرح مادہ کے ذرات ایک صورتِ خاص رکھتے ہیں، اُن میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا اور دنیا میں جو کچھ تغیرات دیکھے جاتے ہیں، یہ اُن ذرات کے اِفتراق و اِجتماع اور کمی بیشی کا نتیجہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ ذراتِ مادہ میں تغیر نہیں اور جب تغیر نہیں، تو حدوث کی کوئی دلیل نہ رہی۔'' (۱)

---

(۱) حل الانتباہات ص ۱۳۳، ۱۳۴

نقد ونظر

تعارف وتبصرہ

مولانا محمد اظہار الحق قاسمی ❖

نام کتاب: مطالعۂ سیرت وتاریخ وتہذیب **تالیف**: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ناشر: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ **صفحات**: ۳۴۴

اسلام ایک آفاقی اور دائمی دین ہونے کے ساتھ ساتھ امن وآشتی، صلح وتحمل اور ایثار وروا داری کی لازوال تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، عدل وانصاف، شرافت ومروت اور اعلی انسانی اوصاف واقدار کے ایسے جلوے اور نمونے اسلامی تہذیب وروایات کا حصہ ہیں جو نہ صرف ماضی کا بیانیہ بلکہ مستقبل کے لئے نشان منزل بھی ہے، اس میں ایسی تہذیبی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور قانونی قوت ہے، جس کی بناء پر انسانیت مسائل کے چنگل سے آزاد ہو اور حقیقی فلاحی معاشرے کے امکانات روشن ہوں۔ قوموں کے تعلقات کار میں تصادم وآمیزش کا عنصر، سماجی، اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں اعلیٰ انسانی اقدار سے صرف نظر کا عنصر، انسانی اخوت کی بنیاد پر عالم گیر معاشرہ کی تشکیل دینے کے بجائے محدود علاقائی، نسلی اور قومی مفادات کا تحفظ یہ ایسے امور ہیں جو اپنی اصلاح کیلئے ایک ایسے اعلیٰ وارفع نظام فکر وعمل کے متقاضی ہیں، جس کی اساس ایک جامع نظریہ اور پیغام پر ہو، کسی رنگ، زبان یا علاقہ کی بنیاد پر نہ ہو، جس قوم اور ملت کی بنیاد کسی نظریہ پر ہوتی ہے اسے اپنی بقاء کیلئے اس نظریہ کا تحفظ کرنا پڑتا ہے، جب تک نظریہ قائم اور زندہ رہتا ہے قوم باقی رہتی ہے، اور جیسے ہی نظریہ کمزور پڑتا ہے قوم کی وحدت اور یک جہتی بھی کمزور ہو جاتی ہے، اور پھر وہ قوم اختلاف وانتشار کی آماجگاہ بن جاتی ہے، تاریخ ایسی قوموں کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اسلام کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے انتہائی تاریک ماحول میں منصف، صالح، مہذب اور پاکیزہ معاشرہ کا نہ صرف نظریہ پیش کیا بلکہ اس کی عملی تشکیل وقیام سے تاریخ میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا کہ جس نظیر پیش کرنے سے تاریخ آج تک قاصر ہے، لیکن غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ ایسی

❖ استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

کون سی وجہ رہی کہ وہ قوم جس نے اپنے افکار واعمال اور نظریات کے ذریعہ دنیا کو جینے کا ڈھنگ سکھلایا، زندگی گذارنے معاشی اور معاشرتی اصول وآداب سے روشناس کرایا، وہی قوم آج اپنے ماضی سے فراموش پستی وزوال کی شکار ہے، اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ داخلی عدم استحکام، پسماندگی، اندرونی کشیدگی اور بیرونی آویزشوں کے سبب مسلمان زوال وپستی کا شکار ہوئے اور اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان اور اسلام کے تصور حیات کو ایک مسئلہ تصور کیا جانے لگا ہے، جس وقت مسلمان انسانی تہذیب کے نگراں تھے اس وقت وہ نہ صرف مہذب دنیا کا محور ومنبع تھے بلکہ اس کے قائد ورہنما بھی تھے۔ جن کی ایک مستقل تاریخ ہمارے سامنے ہے، لیکن ہم نے کبھی ان تاریخی حقائق سے عبرت پذیری کی کوشش نہیں کی، تاریخی حقائق کو محض واقعاتی غیر تجزیاتی انداز میں پڑھنے کے رجحان نے ہمارے فکر ونظر کے دریچے بند کردیئے ہیں، ہمارے فکر ونظر کے دریچے کو ایک بار پھر سے وا کرنے کے لئے ایک ایسے نشان راہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی جس میں تاریخی حقائق کو تجزیاتی انداز میں پیش کیا جائے، پیش نظر کتاب ”مطالعۂ سیرت وتاریخ وتہذیب“ فکر اسلامی پر اپنی مضبوط گرفت رکھنے والے ملک کے معروف اسلامی اسکالر نامور محقق جناب پروفیسر محسن عثمانی ندوی صاحب کی تالیف کردہ اسی اہم ضرورت کی تکمیل ہے۔ جو اپنے موضوع اور اسلوب کے تفرد کی بناء پر شان انفرادیت کی حامل ہے، اس کتاب کو مجموعی طور پر سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، کتاب کی فہرست روایتی اسلوب سے ہٹ کر مرتب کی گئی ہے جس میں ہر عنوان کے تحت پیش کئے جانے والے مضامین کا خلاصہ بھی تین چار لائن میں مختصرا ذکر کیا گیا ہے، پہلا باب ”مطالعۂ سیرت“ کے عنوان سے ہے جس میں چند صفحات کے اندر بطور خلاصہ سیرت نبوی ﷺ اور اس سے حاصل شدہ دروس بیان کئے گئے ہیں، باب کے آخر میں جس دردمند دل کے ساتھ پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مقصد صرف واقعات، احوال اور روایات کا بیان نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ ان واقعات واحوال سے حاصل ہونے والے نظریہ اور پیغام سے ملت کو آگاہ کرانے کیلئے کوشاں ہیں، چنانچہ مسلمانوں کی فکر کو بیدار کرنے اور ان کے زاویۂ نظر کو مہمیز لگانے کیلئے پہلے باب کے ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: ”مسلمانوں میں فکر ودانش کا ارتقا درکار ہے، علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کی ضرورت ہے، فکری بیداری کی ضرورت ہے، زاویۂ نظر کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ عصر حاضر کے چیلنج کو سمجھنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہماری کوششوں کو صحیح سمت مل سکے۔“ (ص:۵۵)

دوسرے باب کا عنوان تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر ہے، جس میں اسلامی تاریخ کے عروج وزوال کی داستان بیان کی گئی ہے وہیں روشن مستقبل کی تلاش بھی، ساتھ ہی دین وسیاست کے اس رشتہ کا بھی ذکر ہے جس میں عہد نبوی ﷺ کے ساتھ عہد خلفائے راشدین اور سلطنت اسلامیہ کے عروج وزوال

کی داستان کے ساتھ تجزیاتی تحریر بھی رقم کی گئی ہے، اس باب کے آخر میں ''اصل تاریخ اسلام کیا ہے'' کے عنوان کے تحت یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ داستان گوئی کا نام تاریخ اسلام نہیں ہے، بلکہ تاریخ اسلام درحقیقت دنیا میں عقیدۂ اسلام کی اشاعت کی تاریخ ہے اور پھر اسی ضمن میں مختلف عناوین کے تحت مسلمانوں کے اسباب زوال پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے اوج ثریا سے تحت الثریٰ تک آگرنے کے اسباب بھی بیان کئے گئے ہیں۔ تیسرا باب ''اسلامی تاریخ میں رواداری اور شرافت اور عدل و انصاف'' کے عنوان سے قائم ہے جس میں اسلامی تاریخ میں انصاف ورواداری، عفو ودرگذر، ہمت و شجاعت اور شوق شہادت کی مثالیں نہ صرف عہد قدیم سے بلکہ ماضی قریب سے بھی پیش کی گئی ہیں۔ چوتھا باب ''پھول کچھ ہم نے چنے خیابان تاریخ سے'' کے عنوان سے قائم ہے، یہ باب تیسرے باب کا ہی تسلسل ہے جس میں کردار کی بلندی اور اعلیٰ اوصاف وکمالات کی ایسی مثالیں پیش کی گئیں ہیں جو شخصیت کی تعمیر میں مفید ہو، پانچواں باب ''یورپ کی نشأۃ ثانیہ اور مسلمانوں کا زوال'' کے عنوان سے قائم ہے جس میں یورپ کی نشأۃ ثانیہ میں مسلمانوں کے کردار کے بیان کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد مسلمانوں کا زوال کیوں کر شروع ہوا، اور مسلمان زوال اور پستی کی جانب کیوں چلے گئے۔

چھٹا باب ''اسلام ہندو مذہب فارسی اور سنسکرت'' کے عنوان سے قائم ہے جس میں ہندو مسلم تعلقات کی ایک خاص جہت اور فارسی وعربی اور مذہب کے باہمی مطالعہ کی روایت کو بیان کیا گیا ہے، اس ضمن میں خاص طور پر مسلمانوں نے اہل وطن کی مقدس کتابوں پر اور اہل وطن نے عربی وفارسی زبان میں جو خدمات انجام دی ہیں، انہیں بطور خاص بیان کیا گیا ہے۔

ساتواں باب ''تاریخ تمدن وتہذیب'' کے عنوان سے قائم ہے، جس میں ''دریا بکوزہ'' کے مثل ابتدائے آفرینش سے لے کر عہد حاضر تک پوری دنیا کی تہذیب وتمدن کی داستان بیان کرکے اسلامی تہذیب وتمدن کے امتیازات اور پھر موجودہ عہد میں اس کے انحطاط کے اسباب ووسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ مختصر کتاب ماضی کا بیانیہ کے ساتھ مستقبل کیلئے نشان راہ بھی ہے جس میں اسلامی پیغامات کی وضاحت بھی ہے دینی وفکری نظریہ کے احیاء کی کوششیں بھی، لیکن اسی کے ساتھ بطور خاص تاریخی واقعات کے بیان میں اگر حوالہ جات اور اس کے مآخذ ومصادر کا اہتمام بھی کیا جاتا تو بہت سے مواقع پر مصدر اصلی کی جانب رجوع آسان اور سہل ہوتا۔ بارگاہ ایزدی میں دعاء ہے کہ حق تعالیٰ مصنف کی اس کاوش کو بارآور بنائیں، اور ان کی کوششیں برآئیں، کتاب کو مقبولیت تامہ عطاء فرمائے اور اسلام کا تصور حیات ایک بار پھر انسانی تہذیب کا نگراں بن جائے۔

❁......❁......❁

احوال و کوائف

خبرنامہ

ماہِ جمادی الاولیٰ کے ماہانہ امتحان کا انعقاد

ابتدائی عربی درجات کی غیر معمولی تعلیمی اہمیت کے پیش نظر حسب معمول از اعدادیہ تا عربی چہارم ماہانہ امتحان کا انعقاد مورخہ ۲۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ مطابق ۲۲؍ دسمبر ۲۰۲۲ء بروز جمعرات اطیب المساجد تحتانی میں کیا گیا۔ جس میں اساتذہ دارالعلوم وقف دیوبند کے علاوہ بیرونِ ادارہ سے بھی حضرات ممتحنین مدعو کئے گئے جنہوں نے طلبہ کی تعلیمی لیاقت پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کلماتِ تحسین ثبت فرمائے۔

ایک اہم علمی محاضرے کا انعقاد

دارالعلوم وقف دیوبند کے شعبۂ بحث و تحقیق حجۃ الاسلام اکیڈمی کے زیر اہتمام قاعۃ الامام شاہ ولی اللہ الدہلوی (کانفرنس ہال) میں ''التفکیر المقاصدی فی ضوء القرآن الکریم'' کے عنوان سے ایک اہم محاضرے کا انعقاد کیا گیا، جس میں امریکہ کی بیلر یونیورسٹی کے باحث و متخصص ڈاکٹر معتز الظاہری نے اپنا قیمتی محاضرہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جا بجا غور و تدبر کی دعوت دی ہے تاکہ اسے دستور حیات بنایا جائے۔ غور و تدبر کا مطلب یہ ہے کہ اس کے معانی و مفاہیم کو سمجھنے اور مرادات ربانی تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ آیات کے اندر غور کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کس امر کا حکم دے رہے ہیں اور اس حکم کا مقصد کیا ہے تاکہ مسلمان غفلت شعاریوں سے گریزاں ہو کر ان تعلیمات و احکامات کو اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کریں۔ انہوں نے کہا کہ قرآنی علوم کے اندر وہ آفاقیت ہے کہ اس کے اندر قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے مسائل کا حل موجود ہے۔ وہ جس طبقہ سے بھی تعلق رکھیں۔ محاضرے کے آخر میں محاضر محترم نے طلبہ کے مختلف سوالات کے جوابات بھی دیئے۔ اس موقع پر متعدد اساتذہ جامعہ موجود رہے۔

حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی جدہ کے ایک عالمی کانفرنس میں شرکت

دارالعلوم وقف دیوبند کے روح رواں و مہتمم حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب مدظلہ گزشتہ

۱۳؍دسمبر ۲۰۲۲ء کو سعودی عرب کے ایک اہم دورے پر تشریف لے گئے جہاں انہوں نے جدہ میں منظمۃ الصحۃ العالمیہ (WHO) اور منظمہ التعاون الاسلامی (OIC) کے زیر اہتمام اور امام حرم مکی فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر صالح بن حمید حفظہ اللہ کی زیر صدارت منعقدہ عالمی کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ اس دوران آپ نے اپنے خصوصی پیغام میں فرمایا کہ صحت اللہ تعالیٰ کی بڑی عظیم ترین نعمت ہے، بلکہ بالفاظ دیگر تعبیرا اگر یہ کہا جائے تو یہ مبالغہ شمار نہیں ہوگا کہ صحت ہی اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم تر نعمت ہے جس کی خشت اساس پر انسان کا جسمانی اور فکری وجود قائم ہے اور ہمہ نوع اعمال وافعال اور زندگی کی خوشیاں اور رنگینیاں نیز فکر ونظریات کی بجا آوری جیسی مہمات حیات حفظان صحت کی ہی مرہون منت ہے، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اصول حفظان صحت سے غفلت وانحراف ہی ہر قسم کی بیماری کا پیش خیمہ بنتا ہے اور اس مضرت کا انسان خود ذمہ دار ہوتا ہے جبکہ حق تعالیٰ نے بحالی وبرقراری صحت کیلئے قدم قدم پر بکھری بے حد وکنار نعمتوں اور ان کے آثار وخواص تک فکری رسائی کی صلاحیتوں سے انسان کو نوازا ہے جس نے اپنے جوہر عقل، فکری گہرائیوں، غور وخوض کی وسعتوں اور بغیر کسی انقطاع کے مسلسل عملی تجربات اور محنتوں کی بنیاد پر اس عملی جدو جہد کو نہ صرف یہ کہ ایک عظیم الشان فن ہی کی شکل دیدی بلکہ مختلف جہتوں سے صدیوں کی عرق ریز جہود سے ترقی کی حیرت انگیز بلندیوں سے انسانیت کو روشناس کرایا۔ انہوں نے کہا کہ صحت و بیماری کے تعلق سے کلام الٰہی کی ہدایات اور احادیث نبوی ﷺ کے واضح ارشادات دلائل قطعیہ اور راہنما اصول کے طور ہمارے فکری شعور کو روشنی فراہم کرتے ہیں، فرمان الٰہی ہے ﴿وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾ ’’جب میں بیمار ہوتا ہوں تو اسی کی وحدہ لاشریک ذات ہے جو ہمیں شفا عطاء فرماتی ہے‘‘، نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ ’’تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، ایک روایت میں فرمایا گیا کہ دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بکثرت لوگ نقصان اور خسارے میں ہیں یعنی ان سے کوئی ایسا کام نہیں لیتے جس سے دینی نفع ہو، ایک صحت اور دوسرے بے فکری، صحت دنیا کی ان چند بیش قیمت نعمتوں میں شمار ہوتی ہے کہ جب تک یہ قائم ہے ہمیں اس کی قدر نہیں ہوتی، مگر جوں ہی یہ ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، ہمیں فوراً احساس ہوتا ہے کہ یہ ہماری دیگر تمام نعمتوں سے کہیں زیادہ قیمتی تھی، جب ہم مختلف پیچیدہ امراض اور مہلک بیماریوں کو دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہماری صحت اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم اور بہت بڑا احسان ہے، لیکن اس کے باوجود اکثر افراد اس نعمت عظمیٰ کی قدر نہیں کرتے ہیں۔



دارالعلوم وقف دیوبند کا تعاون کیسے کریں؟

بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ نے ادارہ کی ترقی کے لیے جو اصول وضع کئے ہیں ان ہی میں سے ایک یہ ہے کہ دارالعلوم کو توکل علی اللہ اور عوامی چندے سے چلایا جائے اور اس کے لیے خاص طور پر غریب طبقہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس لیے جو اہل خیر حضرات دارالعلوم وقف دیوبند کو اپنے عطیات، زکوٰۃ اور صدقات کی رقوم ارسال کرنا چاہتے ہیں ان سے درخواست ہے کہ:

اپنے حلقوں میں پہنچے ہوئے سفراء کرام (جن کے پاس دارالعلوم وقف دیوبند کا شناختی کارڈ ہو) کو رقومات دے کر رسید حاصل کرلیں۔ منی آرڈر، ڈرافٹ یا چیک کے ذریعہ اپنی رقومات براہ راست ارسال کر سکتے ہیں۔ وصولیابی کے بعد رسید ارسال کردی جائے گی۔ اگر براہ راست بینک اکاونٹ میں رقم جمع کرتے ہیں تو بذریعہ ای میل مطلع کردیں تاکہ اس کی تصدیق کرکے رسید ارسال کردی جائے۔

نوٹ: دارالعلوم وقف دیوبند کے چندہ دہندگان 80-G کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

تمام اکاؤنٹس کی تفصیلات

دارالعلوم وقف دیوبند کے کرنٹ اکاؤنٹس یونین بینک آف انڈیا، کارپوریشن بینک اور ایچ، ڈی، ایف، سی بینک میں ہیں، جن کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

UNION BANK OF INDIA		
(1) ACCOUNT TITLE	:	DARUL ULOOM WAQF
ACCOUNT NUMBER	:	372901010014039
BANK	:	UNION BANK OF INDIA (DEOBAND BR)
SWIFT CODE	:	UBININ BBMRT
IFSC CODE	:	537292
AXIS BANK		
(2) ACCOUNT TITLE	:	DARUL ULOOM WAQF
ACCOUNT NUMBER	:	915010029212886
BANK	:	AXIS BANK (DEOBAND BR)
SWIFT CODE	:	AXISINBB
IFSC CODE	:	UTIB0002426
HDFC BANK		
(3) ACCOUNT TITLE	:	DARUL ULOOM WAQF
ACCOUNT NUMBER	:	50200002786907
BANK	:	HDFC BANK (DEOBAND BR)
SWIFT CODE	:	HDFC INBB
IFSC CODE	:	HDFC0001974

رابطہ کے لیے

Maulana Mohammad Sufyan Qasmi
Mohtamim Darul Uloom Waqf Deoband
Near Eidgah, Darul Uloom Waqf Road
Distt. Saharanpur U.P. INDIA Pin-247554

Ph: +91 8439512767
+91 8439412767
Email: rector@dud.edu.in
Website:www.dud.edu.in

RNI UPURD/2010/32139
Postal Regd. No. RNP/SHN/005/ 2020-22

RNI UPURD/2010/32139
Published, Printed and Edited by Mohammad Sufyan Qasmi
on behalf of Darul Uloom Waqf Deoband
Near Eidgah, Moh. Khanqah, P/o Deoband, Distt. Saharanpur (U.P.) &
Printed at Mukhtar Press, Samreen Printers,
Moh. Barziyaul Haq, Deoband (U.P.)

Vol: 14
Issue: 06
Jumādā ath-Thāniyah 1444
Jan 2023

دار العلوم وقف دیوبند کے چندہ دہندگان ۸۰ جی کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ

आयकर अधिनियम की धारा 80 जी के आधीन कर मुक्त प्रमाण पत्र
न. सी. न. (238)/कर मुक्ति/ आ. आ. मु. नगर/आ. आधि (तक)/2009–10 / 9603

Exempted u/s 80G
No (238)/TAX EXEMPT/CIT MZN/I.T.O. (TEC) 2009-10/9603